بیادگار: محبوب العلماء والصلحاء

حضرت اقدس مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی قدس سرہ

قرآن وسنّت اور روایاتِ اسلافِ اُمّت کے آئینہ میں
راہِ تصوّف وسلوک کا قلمی ترجمان!

ماہنامہ

فیضانِ نقشبند

جلد (۱) شمارہ (۳) بابت ماہِ مئی، جون ۲۰۲۶ء

مُدیر

مفتی سیّد احمد اللہ غوری نقشبندی مجدّدی

خانقاہ نقشبندیہ مجدّدیہ اورنگ آباد

www.ilmozikr.com

عشق و مستی کا سفر

محبوب العلماء والصلحاء
حضرت اقدس مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی مجددی قدس سرہ

حج کا سفر عشق و مستی اور محبت کا سفر ہے، جیسے کوئی محب اپنے محبوب کو ملنے جاتا ہے تو دل میں بڑی امنگیں، آرزوئیں اور تمنائیں ہوتی ہیں کہ میں اپنے محبوب سے ملوں گا، ملاقات کے وقت ایسے بیٹھوں گا اور یوں باتیں کروں گا، بالکل اسی طرح بندۂ مؤمن بھی ایسے ہی شوق اور جذبے کے ساتھ حج کا سفر کرتا ہے۔ چناں چہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو لوگ کسی سے جنون کی حد تک محبت کرتے ہیں، ان کو کسی چیز کا پتہ نہیں ہوتا۔ ان کو اپنے کپڑوں سے بھی کوئی غرض نہیں ہوتی۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے بھی حج کے سفر میں حکم دیا کہ میرے بندو! یہ جو ظاہر کی زیب و زینت ہے اس کو تم ختم کرو اور بس دو کپڑے اپنے اوپر اوڑھ لو اور آؤ میرے گھر کی طرف اور جو زینت کے اسباب ہیں وہ بھی اختیار نہیں کرنے، نہ ناخن کٹوانے ہیں، نہ خوشبو لگانی ہے، نہ بال کٹوانے ہیں، نہ جسم پر سے میل ہٹانی ہے۔ تم کو کوئی ایسا کام نہیں کرنا ہے۔ یہ تو عاشقانہ سفر ہے، جیسے عاشق اپنے محبوب کی طرف جا رہا ہوتا ہے تو اس کو بس اپنے محبوب سے ملنے ہی کی آرزو اور تمنا ہوتی ہے اور کسی طرف اس کا دھیان ہی نہیں ہوتا۔ نہ وہ لوگوں سے الجھتا ہے اور نہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

(اقتباس مع تسہیل سوئے حرم صفحہ:۱۰۶)

قرآن وسنّت اور روایاتِ اسلافِ اُمّت کے آئینہ میں
راہِ تصوّف وسلوک کا قلمی ترجمان!

ماہنامہ

فَیضَانِ نَقشبندؒ

جلد(۱) شمارہ(۳) بابتہ ماہِ مئی، جون ۲۰۲۶ء

Volume No.: 1 Issue No.: 3 May, June 2026

مُدیر

مفتی سیّد احمد اللہ غوری نقشبندی مجدّدی

مجلس ادارت

مفتی سیف اللہ قاسمی رائے چوٹی
مفتی محمد عمران قاسمی کورٹلوی
مولانا محمد عمر قاسمی کامار ریڈی

خانقاہ نقشبندیہ مجدّدیہ اورنگ آباد

www.ilmozikr.com

اہم وضاحت

’’ماہنامہ فیضان نقشبند کے تمام مضامین دراصل حضرت مدیر محترم مدظلہ کے مختلف بیانات اور دروس کی تحریری ترتیب ہے۔‘‘ (ادارہ)

فہرستِ مضامین

قندیل ربانی (درسِ قرآن عظیم الشان)	نمازِ تہجد صالحین کا شعار	ضبط وترتیب مولانا محمد عمر قاسمی کامار یڈی	۳
نورِ نبوت (درسِ حدیث شریف)	توبہ کی حقیقت اور اہمیت وفضیلت	ضبط وترتیب مفتی سید عبدالرافع قاسمی	۸
سخن اوّلیں	حج بیت اللہ اور کچھ معروضات	مدیرِ محترم	۱۲
درسِ عقائد	اللہ پاک ذات وصفات میں بے مثل ہیں	ضبط وترتیب: مفتی سیف اللہ قاسمی صاحب	۲۰
اکابر شناسی	نہ ستائش کی تمنا، نہ صلہ کی پرواہ	ابوسید محمد اللہ غوری	۲۳
تعارفِ کتبِ تصوف	مکتوباتِ فقیر	مفتی محمد عمران قاسمی	۲۷
خطوط ہائے راہِ معرفت	درسِ قصدُ السبیل	مفتی احمد اللہ غوری نقشبندی مجددی	۳۵
سازِ محبّت	مناجاتِ منصور رحمۃ اللہ علیہ	مفتی محمد عمران قاسمی کورٹلوی	۴۷
سلوک کی ڈاک	ہدایۃ السالکین	ضبط وترتیب: مفتی محمد عمران کورٹلوی	۵۸
اصلاحی وتربیتی منظوم کلام	تُو تو بس اپنا کام کر، یعنی صدا لگائے جا	حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحب غوری رحمۃ اللہ علیہ	۶۱

قندیلِ ربّانی

(درسِ قرآنِ عظیم الشان)

نمازِ تہجد صالحین کا شعار

ضبط وترتیب: مولانا محمد عمر قاسمی کامار یڈی

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَ مِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (سورۃ الاسراء، آیت: ۷۹)

ترجمہ: "اور رات کے کچھ حصے میں اس (قرآن) کے ساتھ (نمازِ تہجد میں) جاگتے رہیے، یہ آپ کے لیے ایک اضافی عبادت ہے، قریب ہے کہ آپ کے پروردگار آپ کو مقامِ محمود (تعریف کے خصوصی مقام) میں پہنچادیں۔"

اللہ ربّ العزت نے انسان کو اپنی عبادت اور محبت کے لیے پیدا کیا، جس طرح فرض نماز کی ادائیگی سے انسان عابد کہلا سکتا ہے، اسی طرح نمازِ تہجد کے ادا کرنے سے انسان کو محبِ خدا کہا جاسکتا ہے؛ کیوں کہ نمازِ تہجد صرف عظیم عبادت ہی نہیں؛ بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دائمی سنت، خاصانِ خُدا کی امتیازی صفت، صالحین کا شعار، گناہوں کا کفارہ، دخولِ جنت کا سبب، تقرّبِ خداوندی اور محبتِ الٰہی کا ذریعہ، نزولِ رحمت اور حصولِ خیر وبرکت کا موجب، شیطانی اثرات سے حفاظت کی ڈھال اور شرف ومنزلت کا باعث بھی ہے۔

الغرض "نمازِ تہجد" فرائض کے بعد سب سے افضل ترین نماز اور عنداللہ محبوب ترین عمل ہے، ہر بندۂ مؤمن کو نمازِ تہجد کا اہتمام کرنا چاہیے اور بطورِ خاص محبتِ الٰہی کا راستہ طے کرنے والے سالکین نمازِ تہجد کے اہتمام کو اپنے لیے لازم سمجھیں۔

استاذ ابوہریرہ اکیڈمی، اورنگ آباد (آن لائن)

حضرت جی قدس سرہ فرمایا کرتے تھے: کہ "یہ ولایت کی نعمت ہے ہی ایسی جو تہجد کے بغیر نہیں ملتی۔"

نمازِ تہجد کے استحباب اور عنداللہ اس کے مقام و مرتبہ پر کتاب وسنت شاہد ہے؛ لیکن مُوَفَّق مِنَ اللہ بندے ہی اس سعادتِ عظمیٰ سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ محبوبِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: "قیام اللیل یعنی تہجد کا اہتمام کیا کرو؛ کیوں کہ یہ تم سے پہلے صالحین کا طریقہ رہا ہے، اور قیام اللیل پروردگار کے تقرّب کا باعث اور گناہوں سے بچنے کا ذریعہ ہے؛ نیز گناہوں کا کفارہ اور جسم سے بیماریوں کی دوری کا سبب ہے"۔

"عَلَيْكُمْ بِقِيَامِ اللَّيْلِ فَإِنَّهُ دَأْبُ الصَّالِحِينَ قَبْلَكُمْ، وَإِنَّ قِيَامَ اللَّيْلِ قُرْبَةٌ إِلَى اللهِ وَمَنْهَاةٌ عَنِ الْإِثْمِ، وَتَكْفِيرٌ لِلسَّيِّئَاتِ وَمَطْرَدَةٌ لِلدَّاءِ عَنِ الْجَسَدِ"

(سنن ترمذی/کتاب الدعوات عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم/حدیث:۳۵۴۹)

تہجد کے اصل معنیٰ سو کر اُٹھنے کے ہیں؛ اس لیے تہجد کا بہتر وقت یہی ہے کہ رات کے اخیر حصہ میں بیدار ہوکر یہ نماز ادا کی جائے؛ لیکن یہ ضروری نہیں ہے، عشاء کے بعد کبھی بھی نماز تہجد ادا کی جاسکتی ہے؛ البتہ آیتِ مذکورہ میں نمازِ تہجد کے تعلق سے فرمایا: "نافلةً لك" یعنی یہ آپ ﷺ کے لیے زائد نماز ہے؛ اس لیے اکثر اہلِ علم کی رائے ہے کہ پانچ وقت کی نمازیں فرض ہونے سے پہلے ابتداءً نمازِ تہجد فرض کی گئی تھی، بعد میں تہجد کا فرض ہونا اُمت کے حق میں منسوخ کردیا گیا؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کے حق میں اس کی فرضیت باقی رہی۔

(مفاتیح الغیب:۱۰/۱۶۶)

نیز اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی فرمادی کہ جہاں ایک فرض آپ ﷺ کے ذمہ بڑھایا گیا ہے، وہیں آپ ﷺ کو عظیم مقام بھی عطا فرمایا جائے گا، مقامِ محمود کے لغوی معنی ہیں لائقِ تعریف مرتبہ، اور اس مرتبہ کی حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ کو قیامت کے دن شفاعت کا حق دیا جائے گا۔

(ترمذی، عن ابی ہریرۃ: کتاب تفسیر القرآن، باب سورۃ بنی اسرائیل، حدیث نمبر:۳۱۳۷)

گویا نمازِ تہجد روحانی ترقی اور درجات کی بلندی کا باعث ہے۔

تہجد کا وقت سراپا نور اور قربِ الٰہی کی معراجِ کمال کا وقت ہے، تہجد کے موقع پر نبی رحمت ﷺ سے بہت سی دعائیں منقول و ماثور ہیں، ان میں ایک نورانی اور برکت والی معروف دعا یہ ہے: "اللَّهُمَّ اجْعَلْ فِي قَلْبِي نُورًا، وَفِي بَصَرِي نُورًا، وَفِي سَمْعِي نُورًا، وَعَنْ يَمِينِي نُورًا، وَعَنْ يَسَارِي نُورًا، وَفَوْقِي نُورًا، وَتَحْتِي نُورًا، وَأَمَامِي نُورًا، وَخَلْفِي نُورًا، وَاجْعَلْ لِي نُورًا"

(صحیح البخاری/کتاب الدعوات/حدیث:۶۳۱۶)

ترجمہ: "اے اللہ! میرے دل میں نور پیدا کر دیجیے، میری نظر میں نور پیدا کر دیجیے، میرے کان میں نور پیدا کر دیجیے، میرے دائیں طرف نور پیدا کر دیجیے، میرے بائیں طرف نور پیدا کر دیجیے، میرے اوپر نور پیدا کر دیجیے، میرے نیچے نور پیدا کر دیجیے، میرے آگے نور پیدا کر دیجیے، میرے پیچھے نور پیدا کر دیجیے اور میرے لیے ایک نور پیدا کر دیجیے۔"

تہجد کے موقع پر اس مخصوص دعا کے انتخاب میں یہ راز مضمر ہے کہ تہجد کے وقت کو نور سے خاص مناسبت اور تعلق ہے، حضرت جی قدس اللہ سرہ فرماتے تھے کہ "پچھلے دور میں عوام میں یہ بات مشہور تھی کہ یہ (تہجد) پیروں کا وقت ہے۔ (خطبات فقیر، ج:۵، ص:۱۲۳)

تہجد میں بیداری کے اسباب وتدابیر

نمازِ تہجد مہتم بالشان عبادت ہے، اس کی آسانی اور حصولِ توفیق کے لیے معاون اور مؤثر اسباب وتدابیر اختیار کرنا چاہیے؛ چناں چہ سطورِ ذیل میں چند ظاہری اور باطنی اسباب قلم بند کیے جاتے ہیں۔

ظاہری اسباب جیسے:

(۱) خوب سیر ہو کر کھانا نہ کھانا اور کھانے پر کھانا نہ کھانا۔ بہت سے حضرات تابعین رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ قلتِ طعام سے دل میں رقت، فہم میں قوت، طبیعت میں انکساری اور عبادات وطاعات میں نشاط پیدا ہوتا ہے۔

(۲) دن کو اپنے اوپر ایسے مشقت کے کام نہ ڈالے جس سے تھک کر چور ہو جائے اور پٹھے سست پڑ جائیں، اس سے نیند بہت آتی ہے۔

(۳) دن کو قیلولہ کرنا رات کے قیام میں بہترین مددگار ہے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "سحری کے ذریعے دن کے روزے کے لیے مدد حاصل کرو، اور دوپہر کو تھوڑی دیر آرام کر کے قیام اللیل کے لیے مدد حاصل کرو" "اسْتَعِينُوا بِطَعَامِ السَّحَرِ عَلَى صِيَامِ النَّهَارِ، وَبِالْقَيْلُولَةِ عَلَى قِيَامِ اللَّيْلِ"

(سنن ابن ماجہ/ کتاب الصیام/ حدیث: ۱۶۹۳)

(۴) اپنے آپ کو دن کے وقت ہر ایسے کام سے باز رکھنا جو غضبِ خداوندی کا موجب ہو، یعنی تمام معاصی اور گناہوں سے اجتناب کرے۔ امامِ جلیل حضرت حسن بصریؒ سے کسی نوجوان نے اپنی بے ہمتی کی شکایت کی کہ قیام اللیل کے لیے وہ اپنے اندر ہمت وطاقت نہیں پاتا تو آپؒ نے بہت ہی خوبصورت بات ارشاد فرمائی کہ "تیرے گناہوں نے تجھے پابہ زنجیر کر رکھا ہے، بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اس کی وجہ سے وہ قیامِ لیل کی دولت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔" (لیل الصالحین وقصص العابدین)

(۵) عبادت کے لیے اٹھنے میں آسانی کی خاطر باوضو اور داہنی کروٹ پر سونا۔ (الادب فی الدین: ۳۵)

علامہ ابن قیمؒ نے زادالمعاد میں لکھا ہے کہ: "دائیں کروٹ لیٹنے میں ایک خاص رمز ہے، وہ یہ کہ قلب بائیں پہلو میں ہے، تو اگر سونے والا بائیں کروٹ لیٹے گا تو اسے نیند گہری آئے گی؛ کیوں کہ اسے آرام زیادہ ملے گا، اور اگر دائیں کروٹ لیٹے تو دل کے لٹکنے کی وجہ سے پورا آرام اسے نہ ملے گا اور گہری نیند اسے نہ آئے گی، اسی لیے اطباء بائیں کروٹ پر سونے کو مفید قرار دیتے ہیں؛ کیوں کہ اس میں کمالِ راحت اور گہری نیند کا حصول ہوتا ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں کروٹ پر سونے کو پسند کیا ہے تاکہ گہری نیند میں ڈوب کر آدمی قیامِ لیل (تہجد کی نماز) سے غافل نہ ہوجائے۔ (زادالمعاد، ج:۱، ص:۳۲۱)

(۶) اگر تہجد میں خود سے بیدار ہونے کی عادت نہ ہو تو الارم لگانا یا کسی خدمت گار کو مقرر کردینا کہ وہ وقت پر طوعاً وکرہاً بیدار کردیں، خوابِ غفلت میں نہ پڑا رہنے دیں۔

جب چند روز ایسا کریں گے تو امید ہے کہ اس دولت پر بے تکلف پابندی میسر ہوجائے گی۔

باطنی اسباب:

تہجد میں بیداری کے لیے باطنی طور پر جو کوششیں کرنی چاہیے وہ یہ ہیں:

(۱) اخلاصِ قلب: اپنے دل کو ہر قسم کے حسد وکینہ سے پاک رکھنا اور دنیا کے ہموم وغموم اور فضول کاموں سے کنارہ کش ہوجانا۔

(۲) خوفِ خدا پیدا کرنا اور امیدیں کم باندھنا۔ اس لیے کہ جب وہ آخرت کی ہولناکیوں میں غور کرے گا تو اس کی نیند اڑ جائے گی اور خوف بڑھ جائے گا اور دل میں شوق پیدا ہوگا کہ کس طرح نجات حاصل ہوجائے۔

(۳) شب بیداری کی فضیلت کو جاننا۔ قیام اللیل کی فضیلت میں جو آیات واخبار وآثار مذکور ہیں معلوم کرکے توقع اور شوقِ ثواب کو مستحکم کرنا پھر اس کا جی تہجد وقیام کی خواہش کرے گا اور جنت کے درجات حاصل کرنے کے شوق میں آگے بڑھے گا۔

(۴) حق تعالیٰ کی محبت اور ایمان کی قوت پیدا کرنا؛ کیوں کہ جب اس سے محبت ہوگی تو اس کے ساتھ خلوت کو بھی پسند کرے گا۔ اور مناجات سے بھی لطف اندوز ہوگا، پھر مناجات کی لذت اس کو طویل قیام پر آمادہ کرے گی اور بارگاہِ رب العزت میں دائمی حاضری کا سبب بنے گی۔

(۵) شب بیدار تہجد گزار لوگوں کے حالات پڑھنا۔ دوسروں کے عملی نمونے انسان کو عمل کی خاموش دعوت دیتے ہیں، صحابہ کرامؓ وتابعینؒ اور اسلافِ امت کے شب بیداری کے حالات وواقعات کا مطالعہ مہمیز کا کام

انجام دے گا۔

تہجد کے تعلق سے حضرت جی قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ" لینے کا وقت تہجد کا ہے، اور دینے کا وقت پورا دن ہے۔ جو تہجد میں لے گا نہیں وہ دن میں دے گا کیا؟"

بطورِ خاص خواصِ امت کے لیے تو یہ بہت زیادہ اہمیت کی چیز ہے۔

خدامِ دین، دین کے کسی بھی شعبے سے متعلق ہوں، کوئی بھی کام کر رہے ہوں، تہجد میں لینے والے بنیں، پھر دن بھر دینے والے بنیں۔ اس کے لیے باضابطہ تیاری کرنا چاہیے کہ جلد سونے کا اہتمام، تمام گناہوں سے معافی اور تہجد کی توفیق کے لیے دعا کرنی چاہیے۔

ہاں! نمازِ تہجد کی رکعتوں کے تعلق سے یہ وضاحت ذہن میں رہنی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرض نمازوں، سننِ مؤکدہ کے مثل تہجد کی رکعتوں کی تعداد اور کیفیت متعین نہیں فرمائی ہے، اس کا وقت تو متعین ہے؛ لیکن کتنی رکعتیں پڑھی جائیں، اس کا مدار نشاطِ طبع، صحت وقت، شوق و ذوق پر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عموماً اس نماز میں قرأت اور رکوع و سجود طویل فرماتے تھے؛ لیکن یہ ایک مستحب عمل ہے۔

تہجد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتِ دائمی ہے، اگر کوئی یہ کہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دن بھی تہجد نہیں چھوڑی تو وہ اپنی جگہ پر صحیح ہوگا۔ تہجد کے اہتمام کے اعتبار سے حضرت جی قدس سرہ ایک آسان فارمولا یہ بیان فرماتے تھے کہ" آپ اذان سے دس منٹ پہلے اٹھ کر بھی تہجد پڑھ سکتے ہو۔ پانچ منٹ میں وضو بنائیے، پانچ منٹ میں دو رکعت سورۂ کافرون اور سورۂ اخلاص کے ساتھ پڑھیے، تہجد ہوگئی"۔ (تا بہ منزل صرف دیوانے گئے)

تہجد کے لیے طوالت شرط نہیں ہے، اتنا کر لینا بھی کافی ہے۔

عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں:" روح المعانی میں ہے کہ سلفِ صالحین قیام اللیل (نمازِ تہجد) پر ایسی مواظبت (ہمیشگی اور دوام) فرماتے تھے جیسی کہ فرائضِ اسلام پر کی جاتی ہے، اور یہ اس لیے کہ اس میں محبوب کے ساتھ خلوت اور اُنس کا موقع ملتا ہے، اور محبوب ان کے پاس بغیر کسی رقیب کے ہوتا ہے، اسی کو حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحب علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎

کب رات ہو، کب ان سے ہوں خلوت میں پھر بہم
رہتی ہے دُھن یہی ہمیں دن بھر لگی ہوئی

(مجموعہ تالیفات مصلح الامت، ج:۳، ص:۴۲۶)

اَللّٰھُمَّ انْفَعْنَا بِھٰذِہِ الصَّلٰوۃِ وَاجْعَلْنَا قَائِمِیْنَ بِھَا وَلَا تَحْرِمْنَا اَجْرَھَا وَبَرَکَتَھَا

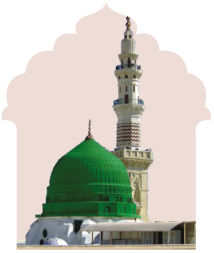

نُورِ نبوّت

(درسِ حدیث شریف)

توبہ کی حقیقت اور اہمیت وفضیلت

ضبط وترتیب: مفتی سید عبدالرافع قاسمی

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال سمعتُ رسولَ اللہِ ﷺ یَقُوْلُ وَاللہِ اِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللہَ وَ أَتُوْبُ إِلَیْہِ فِی الْیَوْمِ اَکْثَرَ مِنْ سَبْعِیْنَ مرَّۃً (صحیح بخاری؛ کتاب الدعوات، حدیث: ۶۳۰۷)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے محبوب علیہ السّلام کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ آپ فرمارہے تھے: "میں اللہ سے مغفرت طلب کرتا ہوں، معافی مانگتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں ایک دن میں ستر مرتبہ سے زیادہ۔"

مذکورہ بالا حدیث کا مرکزی عنوان توبہ کی اہمیت ہے۔

لغت میں توبہ کہتے ہیں واپس آنا اور رجوع کرنا، اصطلاح میں توبہ تین شرائط کے مجموعے کا نام ہے:

(۱) اَنْ یُقْلِعَ عَنِ الْمَعْصِیَۃِ: اس گناہ سے مکمل طور پر باہر آنا، لہٰذا گناہ میں ملوث رہتے ہوئے اور گناہ کرتے ہوئے توبہ کا شریعت میں کوئی تصور نہیں۔

(۲) اَنْ یَنْدَمَ عَلٰی فِعْلِھَا: اس گناہ کے ارتکاب پر ندامت اور شرمندگی ہو کہ مجھ سے یہ گناہ سرزد ہو گیا؛ لہٰذا بغیر ندامت کے توبہ کا کوئی فائدہ نہیں۔

(۳) اَنْ یَعْزِمَ اَلَّا یَعُوْدَ اِلَیْھَا اَبَدًا: اس بات کا پختہ ارادہ ہو کہ اب دوبارہ وہ گناہ نہیں کروں گا، عربی زبان میں "عزم" کہتے ہیں پختہ ارادہ کو؛ لہٰذا توبہ تو کر رہا ہے مگر اس گناہ کو دوبارہ کرنے کا بھی ارادہ ہے تو پھر اس توبہ کا

استاذ ابو ہریرہ اکیڈمی اورنگ آباد (آن لائن)

کوئی اعتبار نہیں۔

ان تین شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے تو توبہ صحیح نہیں ہوئی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اب اگر کوئی سوچے کہ ایسی توبہ تو ہو ہی نہیں سکتی کہ جس کے بعد گناہ نہ ہو تو میری توبہ صحیح ہی نہیں ہوگی؛ لہٰذا مجھے توبہ ہی نہیں کرنی چاہیے۔ یہ ایک غلط فہمی ہے، بندہ کو تینوں شرائط کے ساتھ توبہ کرنا چاہیے اور اگر انسان ہونے کی حیثیت سے گناہ ہو بھی جائے تو دوبارہ توبہ کرلے، توبہ کا دروازہ تو کھلا ہے، نبی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے: اِنَّ اللّٰہَ یَقْبَلُ تَوْبَۃَ الْعَبْدِ مَا لَمْ یُغَرْغِرْ (جامع الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث: ۳۵۳۷)

ترجمہ: ”اللہ پاک توبہ قبول کرتے رہتے ہیں جب تک غرغرہ کی کیفیت شروع نہ ہو جائے۔“

(یَقْبَلُ مضارع کا صیغہ ہے اور مضارع میں استمرار اور دوام کے معنیٰ پائے جاتے ہیں؛ لہٰذا یَقْبَلُ کا ترجمہ ہوگا ”قبول کرتے رہتے ہیں“) جب تک کہ وہ نزع کی حالت میں نہ پہونچ جائے"۔

چناں چہ یہ سوچ کر توبہ چھوڑ دینا کہ گناہ تو بشری تقاضے سے ہوتے ہی رہتے ہیں؛ لہٰذا توبہ کا کوئی فائدہ نہیں، یہ ایک غلط فہمی ہے۔

حقوق العباد کی کوتاہی میں توبہ کی شرط

توبہ کی مذکورہ تین شرائط اس وقت ہیں جب گناہ اور معصیت کا تعلق حقوق اللہ سے ہو۔ اور اگر معصیت کا تعلق حقوق العباد سے ہو تو ان تین شرائط کے ساتھ توبہ کے قبول ہونے کے لیے چوتھی شرط یہ بھی ہے کہ اَنْ یَبْرَأَ عَنْ حَقِّ صَاحِبِہَا: صاحبِ حق کا حق بھی ادا کریں۔ کسی کا مال ناحق ہڑپ لے اور مال لوٹائے بغیر صرف توبہ و استغفار کرتا رہے کوئی فائدہ نہ ہوگا یا کسی کی غیبت کردی یا کسی کو گالی دی تو پہلے صاحبِ معاملہ سے معافی چاہے کہ میں نے آپ کی غیبت کی تھی، میں نے آپ کو برا بھلا کہا تھا اب آپ سے معافی مانگتا ہوں آپ معاف کردیں اور وہ معاف کردے تو توبہ درست ہوگی؛ ورنہ نہیں۔ ہاں اگر یہ کہنے میں (میں نے آپ کی غیبت کی تھی یا آپ کو برا بھلا کہا تھا) مزید فتنے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں اس کی طرف سے صدقہ یا خیرات کردیں یا اس کے گناہوں کے تعلق سے اللہ سے معافی مانگیں، اس کے گناہوں پر آپ روئیں ان شاء اللہ اس کے حق کی تلافی ہو جائے گی مگر یہ اس وقت ہے جب کہ فتنے کا اندیشہ ہو؛ ورنہ صراحتاً اس سے معافی مانگنا ضروری ہے۔

توبہ، مجنوں کی توبہ کی طرح نہ ہو

نیز سچی توبہ کے لیے یہ شرط ہے کہ توبہ تمام گناہوں سے ہو، توبہ ایسی نہیں ہونی چاہیے جیسی کہ غلافِ کعبہ پکڑ کر مجنوں نے کہا تھا کہ: إِلٰهِي تُبْتُ عَنْ كُلِّ ذُنُوبٍ وَلٰكِنْ حُبَّ لَيْلٰى لَا أَتُوبُ
کہ اے اللہ میں ہر گناہ سے توبہ کرتا ہوں؛ لیکن لیلیٰ کی محبت سے توبہ نہیں کرسکتا۔

لہٰذا بندہ اگر کسی ایک گناہ کا عادی ہو، اس میں ملوث ہو اور یوں توبہ کرے کہ تمام گناہوں سے توبہ ہے مگر اس گناہ سے نہیں تو ایسی صورت میں تمام گناہ معاف تو ہو جائیں گے مگر اس گناہ کا وبال باقی رہے گا۔

سالکین کے لیے ایک اہم بات

بہت سے سالکین فائدہ نہ ہونے کی شکایت کرتے ہیں تو ان میں سے اکثر کا یہی مسئلہ ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی گناہ میں اٹکے ہوئے ہوتے ہیں، اوراد و اذکار اور مراقبہ کا ثواب مل رہا ہوتا ہے مگر مکمل طور پر فائدہ نہیں ہوتا؛ کیوں کہ ہر گناہ سے سچی پکی توبہ نہیں کی گئی ہے جب کہ ہر گناہ سے سچی پکی توبہ کرنا ضروری ہے چاہے چھوٹا گناہ ہو یا بڑا گناہ۔

توبہ کی اہمیت

توبہ کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ نبی علیہ السلام دن میں ستر سے زائد دفعہ توبہ فرمایا کرتے تھے: جیسے کہ اوپر گزرا۔

ستر کا لفظ عربی زبان میں کثرت کے لیے استعمال ہوتا ہے تو مطلب ہوا کہ ’’میں کئی دفعہ توبہ کرتا ہوں‘‘، ’’کثرت سے توبہ کرتا ہوں‘‘، ’’بہت زیادہ توبہ کرتا ہوں کہ اس کو شمار نہیں کیا جاسکتا‘‘

نکتہ

اس کا یہ مطلب نہیں کہ نبی علیہ السلام تسبیح لے کر بیٹھ جایا کرتے تھے اور دن بھر استغفار کرتے رہتے تھے مطلب یہ ہے کہ محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام دن اور رات کا اکثر حصہ ندامت کے ساتھ گزارتے تھے، ہر وقت قلب میں احساسِ ندامت ہوتا کہ مجھ سے کچھ نہیں ہوا مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ وَ مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ اور یہی حقیقی توبہ ہے۔ جیسا کہ بعض مشائخ نے فرمایا کہ اللہ کو پانے والا وہ ہوتا ہے جو یہ کہے کہ میں اللہ کو نہیں پاسکتا، میں اللہ تک نہیں پہونچ سکتا ”اَلْعَجْزُ عَنْ دَرْكِ الذَّاتِ إِدْرَاكٌ“

گویا امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ حال ہے کہ

صبح توبہ ہے شام توبہ ہے
میرے لب پہ مدام توبہ ہے

اور ہم ادنیٰ ترین امتیوں کا یہ حال ہے کہ کبھی کبھار توبہ کے کلمات پڑھ کر اپنے آپ کو پاک سمجھنے لگتے ہیں۔

توبہ کی فضیلت

چناں چہ حدیث شریف میں آیا ہے، حضرت انس ؓ راوی ہیں عن أَبِي حمزةَ أَنَس بنِ مَالِك الأنصاري خادِمِ رَسولِ اللهِ ﷺ اَللّٰهُ أَفْرَحُ بِتَوْبَةِ عَبْدِهٖ مِنْ أَحَدِكُمْ سَقَطَ عَلٰى بَعِيْرِهٖ وَ قَدْ اَضَلَّه فِي أَرْضٍ فَلَاةٍ (صحیح بخاری، کتاب الدعوات، حدیث ۶۳۰۹)

توبہ کی فضیلت کو سمجھانے کے لیے نبی علیہ السلام نے ایک مثال دی ہے کہ "ایک آدمی جنگل بیابان میں یکا یک محتاج ہو جائے، سواری و سامان سب کھو جائے اور سوائے موت کے کچھ نظر نہ آ رہا ہو پھر اچانک اس کی سواری مع ساز و سامان مل جائے تو ایسے بندے کو اس وقت جتنی خوشی ہوتی ہے اس سے زیادہ خوشی اللہ پاک کو اس وقت ہوتی ہے جب اللہ سے بچھڑا ہوا بندہ اللہ سے رجوع کرتا ہے۔

اللہ پاک توبہ کرنے والے بندے سے بہت خوش ہوتے ہیں۔

لہٰذا ہمیں چاہیے کہ دن و رات، توبہ و استغفار کو اپنا معمول بنالیں۔ اللہ پاک کی قبولیت کے دروازے قیامت تک کھلے ہیں شاید کہ صبح کا بھولا شام گھر لوٹ آئے اور شام کا بھولا صبح گھر لوٹ آئے؛ جیسا کہ ایک حدیث میں وارد ہے حضرت ابو موسیٰ اشعری ؓ راوی ہیں: إِنَّ اللهَ يَبْسُطُ يَدَهٗ بِاللَّيْلِ لِيَتُوبَ مُسِيْئُ النَّهَارِ وَ يَبْسُطُ يَدَهٗ بِالنَّهَارِ لِيَتُوبَ مُسِيْئُ اللَّيْلِ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا
(صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، حدیث ۵۹۸۹)

کہ اللہ پاک کا معمول ہے کہ اللہ روز آنہ اپنے ہاتھ پھیلاتے ہیں جیسا ماں بچے کے لیے پیار سے اپنی باہیں پھیلاتی ہے کہ دن کا گناہ گار شام کو توبہ کر لے اور رات کا گنہگار دن کو توبہ کر لے۔ یہی مطلب ہے کہ اللہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔

اللہ پاک توبہ کرنے والے بندوں میں شامل فرمائیں۔ (آمین)

☆☆☆

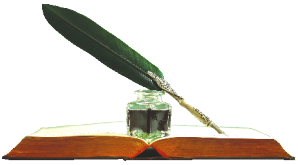

سُخنِ اوّلیں

حج بیت اللہ اور کچھ معروضات

از: مدیر

موسمِ حج آ چکا، دنیا کے گوشے گوشے میں ہر کلمہ گو مسلمان کی زبان پر حرمین شریفین کے تذکرے ہیں۔ عشاقِ الٰہی کے کچھ قافلے حرمین شریفین کی مقدس سرزمین پر پہونچ کر وہاں کی پاکیزہ فضاؤں میں رات و دن بسر کر رہے ہیں، کچھ محو سفر ہیں تو بہت سے پابہ رکاب۔ حج کے موسم میں مسلمانوں کی یہ تیاریاں آخر کس لیے ہیں؟ حرمین پہونچنے کے لیے اس قدر ذوق وشوق، ایسی طلب وتڑپ اور اس درجہ بے قراری و بے چینی کی آخر وجہ کیا ہے؟ کیا وہاں عالمی میلہ ہے؟ کوئی تفریحی تقریب ہے؟ کوئی تعلیمی کانفرنس ہے؟ یا پھر تجارتی نمائش ہے؟ نہیں۔ یہ تو دراصل عملی تصویر ہے اس لبیک کی، جو صدیوں پہلے صدائے ابراہیمی پر کہی گئی تھی۔ ارشادِ ربانی ہے: وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ

ترجمہ: اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو، لوگ تمہارے پاس پیدل بھی آئیں گے اور دُبلی اونٹنیوں پر بھی، جو دور دراز سے پہنچی ہوں گی۔ (سورۃ الحج، آیت: ۲۷)

☆☆☆

ایام حج تو پانچ دن ہیں یعنی ذی الحجہ کی ۹/ تاریخ سے ۱۳/ تاریخ تک، لیکن حج کا موسم ماہِ شوال ہی سے شروع ہوجاتا ہے۔ چناں چہ اگر کوئی ماہِ شوال میں ہی حج کا احرام باندھنا چاہے تو شریعت میں اس کی اجازت ہے اور پچھلے دور میں ایسا ہوا بھی کرتا تھا کہ لوگ ماہِ شوال میں ہی اپنے گھروں سے حج کا احرام باندھ کر سفرِ حج پر نکلا کرتے تھے۔ اس اعتبار سے ماہِ شوال اور ماہِ ذی قعدہ بھی حج کے مہینے ہیں۔ لہٰذا ادب یہ ہے کہ ان مہینوں کا احترام کیا جائے۔ آج کے دور میں نسبتوں کا احترام بالکل ختم ہوتا جارہا ہے۔ نہ مقدس راتوں کا احترام نظر آتا ہے

نہ مقدس اوقات اور دنوں کا۔ پچھلے چند برسوں پہلے تک بھی لوگ ماہِ رمضان المبارک کا، شبِ برأت وشبِ قدر جیسی مقدس راتوں کا، اسی طرح یومِ جمعہ کا بھی احترام کیا کرتے تھے اور نسبتوں کے احترام میں گناہوں سے، اللہ کی نافرمانیوں سے اور دیگر غلط کاموں سے اپنے آپ کو بچایا کرتے تھے۔ آج حال یہ ہوگیا ہے، اللہ ہمیں معاف فرمائے کہ تہجد کے مبارک وقت میں بھی موبائل کے گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ کیسی افسوس کی بات ہے کہ وہ وقت، جو اللہ سے راز و نیاز کا ہے، اللہ کے سامنے اپنی حاجتیں رکھنے اور دعائیں قبول کروانے کا ہے اور گویا اللہ پاک سے اللہ کو مانگنے کا وقت ہے، اس مبارک وقت میں بھی گناہوں میں ابتلا؟ یہ اس درجہ محرومی کی بات ہے کہ اس پر جتنا رویا جائے کم ہے، بالکل اسی طرح حج کے مہینے شروع ہوجائیں لیکن ہم غفلت میں پڑے رہیں اور گناہوں والی زندگی جوں کی توں بسر ہوتی رہے، یہ بھی بڑے افسوس کی بات ہے!

اگر کوئی شخص اپنی سستی اور غفلت کی وجہ سے حج کے اِن مبارک مہینوں میں نیکیوں کی توفیق سے محروم ہے تو کم از کم یہ فکر تو ضرور کرے کہ وہ گناہوں سے بچنے کا مکمل اہتمام کرے گا، اس لیے کہ آج کے گناہوں والے ماحول میں اس کا اہتمام بھی کسی سعادت مندی سے کم نہیں۔

☆☆☆

حج کا یہ فریضہ اسلام کا ایک اہم رکن ہے، جس کی ادائیگی ہر اُس مسلمان پر ضروری ہے، جو حرم تک پہونچنے کی استطاعت رکھتا ہو، فقہاء کرام نے استطاعت کی تفصیل میں لکھا ہے کہ ضروریاتِ زندگی سے زائد رقم میں آمد ورفت کے اخراجات اور حرم جانے سے لے کر واپس ہونے تک اہل وعیال کے نان ونفقہ کا انتظام ہو، راستہ کے پُرامن ہونے کی شرط کے ساتھ۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے کہ ہم میں کتنے لوگ ہیں جو فریضۂ حج کی استطاعت رکھنے کے باوجود اس میں کسی شرعی عذر کے بغیر تاخیر کرتے رہتے ہیں۔ ملازمت کا بہانہ، کاروبار کا عذر، بچوں کی تعلیم کا مسئلہ، لڑکیوں کی شادیاں، دیگر خانگی وخاندانی ذمہ داریاں اور اس جیسی باتیں شریعت کے نزدیک غیر معتبر ہیں۔ حج فرض ہوجانے کے بعد اس کی جس قدر جلد ادائیگی ہوسکے، کرنی چاہیے، یہی حکمِ شرعی ہے۔ اس میں بدوں عذرِ شرعی تاخیر کرنا گناہ ہے۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ حج فرض ہوجانے کے باوجود اس کی ادائیگی میں اگر کوئی کوتاہی کرے اور اسی حال میں دنیا سے چلا جائے تو اس کے لیے نبی علیہ السلام کی زبانی کیسی سخت وعید ہے۔ ارشادِ نبوی ہے: مَنْ لَمْ يَمْنَعْهُ عَنِ الْحَجِّ حَاجَةٌ ظَاهِرَةٌ، أَوْ سُلْطَانٌ جَائِرٌ، أَوْ مَرَضٌ حَابِسٌ، فَمَاتَ وَلَمْ يَحُجَّ، فَلْيَمُتْ إِنْ شَاءَ يَهُودِيًّا، وَإِنْ شَاءَ نَصْرَانِيًّا ''جس شخص کو حج کرنے سے ظاہری ضرورت یا ظالم حاکم، یا روک دینے والی بیماری نہ روکے اور وہ بغیر حج کیے ہوئے مرجائے، تو چاہے تو وہ یہودی

کی موت مرے اور چاہے نصرانی کی موت مرے۔‘‘ (سنن دارمی/من کتاب المناسک/حدیث: ۱۸۲۳)

دوسری طرف اِس دور میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، جو حج اور عمرے کی ادائیگی کے حوالے سے غُلو میں مبتلا ہیں۔ ان کے ذمے قرض ہوگا، وراثت میں وہ اپنی بہنوں کے حصہ پر ناجائز قبضہ کیے ہوئے ہوں گے، یتیموں کا مال کھا گئے ہوں گے، کسی کی زمین ہڑپ لی ہوگی؛ لیکن حج پر حج اور ہر سال عمرہ کیے جاتے ہیں۔ جاننا چاہیے کہ اہلِ حقوق کے حق کی ادائیگی شریعت کے نزدیک انتہائی لازمی ہے اور اس بارے میں کل قیامت میں سخت پوچھ تاچھ ہوگی لیکن اس سلسلے میں کوتاہی کرکے اور دوسروں کے مالی حقوق ادا نہ کرکے حج کے لیے جانے سے لوگوں کے درمیان حاجی تو کہلائیں گے لیکن حج کی روح سے اور اس کے پاکیزہ انوارات اور برکات سے محروم رہیں گے۔ حقوق ادا نہ کرکے ہر سال عمرے کی ادائیگی سے معاشرے میں نام تو ہوسکتا ہے؛ مگر دربارِ الٰہی میں کوئی ذکر تذکرہ نہ ہوگا؛ لہٰذا حج کے سلسلے میں ہر قسم کے افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اعتدال پر رہنے کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیے کہ فریضۂ حج کی ادائیگی کی توفیق سراسر من جانب اللہ ہے۔ اس میں دخل انسان کی دولت وشہرت کا ہے نہ عزت ومنصب کا۔ یہی وجہ ہے کہ کتنے لوگ ہوتے ہیں، جن کے پاس بہ ظاہر سفرِ حج کے وسائل نہیں ہوتے، لیکن حج کی سعادت سے بارہا بہرہ ور ہوتے رہتے ہیں۔ جب کہ دوسری طرف دیکھا جائے تو پوری دنیا میں مال اور دولت، عزت اور شہرت، اقتدار اور تعلقات کے اعتبار سے ہزاروں مسلمان ایسے ہیں، جو ہر سال حج کرسکتے ہیں؛ بل کہ اپنے ساتھ مزید ہزاروں افراد کو حج کرواسکتے ہیں؛ لیکن وہ حجِ نفل تو درکنار حجِ فرض کی ادائیگی سے بھی محروم رہتے ہیں۔ اس لیے حجِ مقبول کی سعادت سے بہرہ مندی اور حرمین شریفین کی قبولیت والی حاضری کے لیے اللہ کے دربار میں تڑپنا اور خوب مانگنا چاہیے۔

☆☆☆

ہمارے اسلاف واکابرؒ کو حرمین شریفین سے والہانہ تعلق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حجِ بیت اللہ کی سعادت بار بار حاصل کرنے کے لیے مسلسل کوشاں اور فکرمند رہتے تھے اور جوارِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اپنی زندگی کے آخری دن گذارنے کے لیے بے چین وبے قرار رہتے تھے۔ اگر کسی وجہ سے حجِ بیت اللہ کا موقع نہ ملتا تو ایامِ حج میں ان کی تڑپ دیدنی ہوتی۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ (دیوبند کے زمانۂ قیام میں) ’’جب حج کے ایام شروع ہوجاتے تو آپؒ کو گھر میں چین نہیں آتا تھا، کبھی اِدھر چلے جاتے، کبھی اُدھر چلے جاتے؛ حتیٰ کہ دسترخوان پر کھانا کھاتے ہوئے بھی جب خیال آجاتا تو کہتے معلوم نہیں

عُشّاق کیا کررہے ہوں گے، یہ کہہ کر کھانا چھوڑ دیتے اور آہیں بھرنے لگتے اور کہتے کاش کوئی دن آئے کہ حسین احمد کو بھی اس جگہ کی زیارت نصیب ہوجائے۔'' (اسلاف کے حیرت انگیز واقعات)

چناں چہ جو لوگ حج کو نہیں جاسکے، انہیں اللہ پاک کے دربار میں مسلسل دعائیں مانگنی چاہییے اور حجاج کرام کے ساتھ محبت و احترام کے جذبات سے پیش آنا چاہیے کہ حجاج کرام دراصل **ضُیوفُ الرّحمٰن** (اللہ کے مہمان) ہیں۔

اسی کے ضمن میں حجاج کرام کے لیے ایک اہم بات یہ ہے کہ اُنہیں حج کی اِس سعادتِ عظمیٰ پر نازاں نہیں ہونا چاہیے؛ بل کہ دل میں یہ سوچنا چاہیے کہ مجھ گناہ گار، خطا کار، سیاہ کار اور مجرم کو محض اپنی اصلاح کرنے کے لیے اور بیت اللہ حاضر ہوکر گناہوں کو دھونے کے لیے اللہ کی طرف سے یہ ایک موقع دیا جارہا ہے اور اگر میں اس عظیم نعمت کی قدر نہ کروں تو کتنی بڑی محرومی کی بات ہوگی۔

☆☆☆

حج کا یہ فریضہ سراسر عشق و محبت اور دیوانگی وخود سپردگی سے عبارت ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ احرام کی بے سلی ہوئی دو چادریں پہننے کے حکم میں آخر حکمت کیا ہے؟ زیب و زینت اختیار کرنا آخر کیوں ممنوع ہے؟ خوشبو کا استعمال تو تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے؛ لیکن حالتِ احرام میں اس کی بھی ممانعت ہے۔ پھر خانۂ کعبہ کے گرد چکر لگوانا، صفا و مروہ پر سعی کروانا، منیٰ میں قیام، عرفات میں وقوف، مزدلفہ کی شب گذاری، شیطانوں پر کنکر برسانا، قربانی کے جانور پر چھری چلانا۔ آخر ان کے اسرار ورموز کیا ہیں؟ اہلِ عقل و دانش کو کوئی جواب نہیں ملے گا سوائے اس کے کہ یہاں دیوانگی مطلوب ہے، یہاں عبدیت اور بندگی مقصود ہے، اس سفر میں تو قدم بہ قدم محبت و فدائیت کا امتحان ہے اور اس راہ میں وہی کامیاب ہیں جو درِ محبوب پر دلِ نیاز مند لیکر حاضر ہوتے ہیں۔ حج کی ندا لگانے والے اُولُوا العزم پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت میں نفس کُشی اور وفاداری، وارفتگی اور بندگی، محبت اور فدائیت کے ایسے ہی نمونے جابہ جا نظر آتے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے: **وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ** (سورۃ البینہ، آیت: ۵)

ترجمہ: ''اور انہیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ اللہ کی عبادت کریں، دین کو اسی کے لیے خالص رکھتے ہوئے، یکسو ہوکر۔''

جب حج کا سفر از اول تا آخر عاشقانہ ٹھہرا تو اس میں ناز نخروں کی کہاں گنجائش؟ جب اس مبارک سفر میں عبدیت واطاعت مطلوب ہے تو ریاکاری، نام ونمود، اور نمائش وشہرت کیسے درست؟ اس میں جب وفا کا امتحان

ہے تو گناہوں کی کیسی جسارت؟ ڈرنا چاہیے اور خوب خوب، رونا چاہیے اور قدم بہ قدم۔ اس پورے سفر میں اپنے جرموں کا اقرار ہو، اپنے قصوروں کا اعتراف ہو، اور پھر ہر ہر مرحلہ پر ندامت و شرمندگی اور توبہ و استغفار ہو۔ جان لینا چاہیے کہ زادِ راہ اس سفر میں توشۂ امیدِ کرم کے سوا کچھ نہیں!

☆☆☆

آدابِ سفرِ حج میں سے گناہوں سے سچی توبہ اور نیتوں کی درستی کے بعد یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حقوق العباد کی ادائیگی کے لیے فکرمند ہو جائیں۔ کسی کو ناحق کچھ کہہ دیا تھا تو معافی تلافی کر لیں، مالی حقوق (بہ طور خاص قرض، تقسیمِ وراثت اور مہر وغیرہ) کی ادائیگی میں اب تک کوتاہ رہے تو اس کو بھی بہ جلد پورا کر لیں؛ تاکہ اس نبوی بشارت کا صحیح معنوں میں مصداق بن سکیں، جو حج سے واپس ہونے والوں کے حق میں آپ نے سنائی ہے۔ ارشادِ نبوی ہے: مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ، رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ (متفق علیہ)

ترجمہ: ''جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے حج کرے، پھر (دورانِ حج) نہ کوئی بے حیائی کی بات کرے اور نہ کوئی گناہ کرے، تو وہ (گناہوں سے پاک ہو کر) اس دن کی طرح لوٹتا ہے جس دن اس کی ماں نے اسے جنا تھا۔''

☆☆☆

حج کا احرام باندھتے وقت نیت کرتے ہوئے یہ دعا پڑھنے کا حکم ہے: اَللّٰهُمَّ إِنِّي أُرِيدُ الْحَجَّ فَيَسِّرْهُ لِي وَتَقَبَّلْهُ مِنِّي

ترجمہ: اے اللہ! میں حج کی سعادت حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، لہٰذا آپ حج (کے تمام ارکان) کو میرے حق میں آسان کر دیجیے اور اس کو میری طرف سے قبولیت بھی عطا فرمائیے۔ اس دعا کے ضمن میں پتہ چلا کہ حج کے ارکان کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی کسی کے حق میں اس وقت تک آسان نہیں ہے، جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسانی کا معاملہ نہ ہو، اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ ارکانِ حج کی ادائیگی کے ساتھ اس کی قبولیت بھی بڑی اہم ہے۔ چناں چہ آدابِ حج میں سے یہ بات ہے (اور یہی بات عمرہ کی ادائیگی کے موقع پر بھی ہے) کہ حج کی آسانی اور قبولیت کے لیے بطورِ خاص دعاؤں کا اہتمام کرنا چاہیے۔

اَلْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَاتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ وَاتَّقُونِ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ

(سورۃ البقرہ: ۱۹۷)

ترجمہ: ''حج کے مہینے معلوم و مقرر ہیں، پس جو شخص ان مہینوں میں حج لازم کر لے (یعنی احرام باندھ لے)

تو (حج کے دوران) نہ کوئی بے حیائی کی بات کرے، نہ گناہ کا ارتکاب کرے اور نہ جھگڑا کرے اور تم جو بھی نیکی کرو گے، اللہ پاک اسے خوب جانتے ہیں۔ اور (سفرِ حج کے لیے) زادِ راہ لے لو، بے شک بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے اور اے عقل والو! مجھ سے ڈرتے رہو۔''

مذکورہ بالا آیتِ کریمہ میں فریضۂ حج کا گویا فلسفہ بیان کیا گیا ہے، یعنی حج کے اس اہم فریضے کے حوالے سے چند بنیادی اور اہم ربانی ہدایات دی گئی ہیں، جن کا پاس ولحاظ رکھنا بہر حال ضروری ہے، جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) فَلَا رَفَثَ: مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ''رَفَثْ'' ایک جامع لفظ ہے جس میں عورت سے مباشرت اور اس کے مقدمات؛ یہاں تک کہ زبان سے عورت کے ساتھ اس کی کھلی ہوئی گفتگو بھی داخل ہے، مُحرِم کے لیے حالتِ احرام میں یہ سب چیزیں حرام ہیں۔ (معارف القرآن، ج:۱)

پتہ چلا کہ حالت احرام میں جب بیوی کے ساتھ جو چیزیں جائز اور حلال تھیں، وہ بھی جب ناجائز اور حرام ٹھہریں تو ایسے گناہ جن کا تعلق سراسر شہوت سے ہے، بدنگاہی اور گندی سوچ وغیرہ، سب کے سب بدرجہ اولیٰ حرام ہیں۔ گویا اللہ پاک یوں ارشاد فرما رہے ہیں کہ جب حج کے لیے آرہے ہو تو ذہن میں رہے کہ شہوت والے کسی بھی گناہ کا خیال تک ذہن میں نہیں آنا چاہیے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ جب حج کی عبادت میں خصوصیت کے ساتھ للّٰہیت مقصود ہے جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا (سورۃ آلِ عمران، آیت:۹۷)

ترجمہ: ''اور اللہ ہی کے لیے لوگوں پر اس گھر (کعبہ) کا حج کرنا فرض ہے، جو اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو'' تو اللہ پاک کو کسی بھی طرح کا تعلق بالغیر گوارا نہیں۔ چنانچہ ایک طرف زبان سے لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ کلمات بھی کہے جائیں اور دل میں غیرُ اللہ کے ساتھ ناجائز تعلق بھی رکھا جائے، یہ کیسے درست ہوگا؟ یہ تو ایک گونہ شرک ہوگیا۔ اسی لیے اللہ پاک نے قرآن مجید میں ''فَلَا رَفَثَ'' کہہ کر بے حیائی اور شہوات والے کاموں کی مطلقاً نفی کی، جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حج کے دوران شہوت والے گناہوں بلکہ حالت احرام میں شہوت والے جائز کاموں کی بھی گنجائش نہیں ہے۔

زمانۂ جاہلیت کے واقعات میں سے ہے کہ اِساف اور نائلہ نامی دو مرد و عورت تھے، جن کے درمیان ناجائز تعلقات تھے، ان کا یہ ناجائز باہمی تعلق اتنا بڑھا کہ دونوں کی عقلوں پر پردہ پڑ گیا اور وہ دونوں کعبۃ اللہ جیسے مقدس اور پاکیزہ مقام کے اندر زنا کر بیٹھے، پھر تو اللہ پاک کا نظامِ عقوبت حرکت میں آگیا اور ان دونوں کو اس جرم کی پاداش میں پتھر بنا دیا گیا۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد ۱، صفحہ ۳۳۶)

پچھلے دور میں لوگ حرمین کے تقدس کا بہت احترام کیا کرتے تھے لیکن آج یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ حج وعمرے کو جانے والوں کی حرمین شریفین کی پاکیزہ سرزمین پر بھی نگاہیں میلی ہوتی ہیں۔ بلکہ قیام گاہوں (ہوٹلس) میں شرعی پردے پر عمل نہ ہونے کی وجہ سے نامحرم مردوں اور عورتوں کے درمیان بے حجابانہ گفتگو ہوتی ہے اور پوری بے تکلفی سے نامحرم مردوں کے ساتھ بیٹھ کر عورتیں کھانا کھاتی ہیں۔ اسی طرح بہت سی عورتیں اپنے محرم کے بغیر حج اور عمرے کا سفر کر رہی ہیں، جس کی شریعت میں بالکل بھی اجازت نہیں ہے۔ جاننا چاہیے کہ یہ سب کبیرہ گناہ ہیں اور ان کے ارتکاب کی وجہ سے حج اور عمرے کی برکات اور وہاں کے پاکیزہ انوارات کا ذرہ بھی نصیب نہیں ہوگا بلکہ عبادت تو ایک طرف رہی، ایسے لوگوں کے ساتھ اللہ پاک کی ناراضگی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ نامحرموں کے ساتھ بے تکلفی اور بے حجابی؛ نیز حرمین شریفین میں اجنبی مردوں اور عورتوں کے درمیان بے پردگی اور بدنگاہی کی وجہ سے ایسے واقعات بھی سامنے آ رہے ہیں کہ حج اور عمرے کے درمیان ان کے آپس میں مراسم بھی قائم ہو گئے اور واپس آنے کے بعد پھر نکاح کیا گیا۔ (نعوذ باللہ)

اسی ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین ہونی چاہیے کہ اگر کسی کو حرمین شریفین میں خوب عبادت کرنے کا موقع نہ مل سکے، یا کوئی شخص سستی کاہلی کی وجہ سے تہجد، تلاوتِ قرآن اور نوافل کے اہتمام سے محروم رہا؛ یہاں تک کہ کثرتِ طواف (جو حرمِ مکی کی خاص الخاص عبادت ہے، اس) کی بھی توفیق حاصل نہ ہوئی تب بھی کوئی حرج نہیں، اس لیے کہ اللہ پاک نے حج وعمرے کی عبادت کے حوالے سے جو ہدایات دی ہیں، ان میں کثرتِ عبادت پر زیادہ زور نہیں دیا گیا۔ ہاں! ہر طرح کی بے حیائی اور بدنظری والے گناہوں سے بچنے کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی حرمین شریفین میں بدنگاہی کے گناہ سے اور اسی طرح گناہوں کے گندے خیالات سے بچنے کا اہتمام کرتا ہے تو وہ اس دور کا بہت بڑا عبادت گذار انسان ہے۔

(۲) **وَلَا فُسُوقَ**: دوسری ہدایت جس کا دورانِ حج بہ طورِ خاص خیال رکھنا ہے وہ ہے ہر قسم کے فسق سے بچنا۔

ایک تفسیر کے مطابق اس سے مراد محظوراتِ احرام ہیں، جن کی تفصیل حج کی کتابوں میں بہت شرح وبسط کے ساتھ مذکور ہے اور ایک تفسیر کے مطابق یہاں فسق سے مراد ''تمام گناہ'' ہیں۔ لہٰذا حج کے دوران تمام گناہوں سے بچنے کا بہ طورِ خاص اہتمام ہونا چاہیے۔

حج بھی کیا جائے اور دورانِ حج ڈاڑھی ترشوائی جائے؟ ارکانِ حج کی ادائیگی میں مشغول ہوں اور ساتھ ساتھ غیبت، جھوٹ، چغلی میں بھی ابتلا ہو؟ یہ ہرگز درست نہیں۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے گناہ سے بچنے کا مکمل اہتمام ہونا چاہیے۔

(۳) وَلَا جِدَالَ: تیسری ہدایت جو دی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ حج کے دوران لڑائی جھگڑے سے اپنے آپ کو کوسوں دور رکھنا ہے۔ تجربہ ہے کہ اس سفر میں لڑائیاں بہت ہوتی ہیں، اس لیے نہ باہم دست و گریباں ہوں، نہ آپس میں گالی گلوچ کریں؛ بل کہ ہر طرح کے بحث و مباحثہ سے اجتناب ہو اور ہر نوع کی سخت کلامی سے گریز۔ حج کا یہ سفر تو از اول تا آخر صبر کا امتحان ہے۔ اس سفر میں ناگواریاں ہوں گی اور ضرور ہوں گی لیکن برداشت کرنا ہے، غصہ آئے گا اور بہت سی دفعہ آئے گا لیکن اس کے تلخ گھونٹ پی جانا ہے، طبیعت اور مزاج کے خلاف امور پیش آئیں گے اور بہت کثرت سے لیکن دامنِ صبر کو مضبوطی سے تھامے رکھنا ہے؛ یہی آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شیوہ اور آپ کی تعلیم ہے۔

(۴) وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَى: یہ چوتھی ہدایت ہے اور اہم ترین ہدایت ہے۔ حج کی تیاری ظاہری انداز میں بھی ہونی چاہیے کہ سفر میں اس سے سہولت ہوتی ہے۔ ضرورت؛ بلکہ راحت کا سامان ساتھ رہے، مختلف دوائیں بھی رکھ لی جائیں کہ بہ وقتِ ضرورت کام آسکیں، لیکن مفسرین کرام نے ایک اہم نکتہ یہ بھی بیان کیا ہے کہ حج کا سب سے بہترین توشہ تقویٰ ہے۔ تقویٰ اگر نہ ہو تو عبادتوں پر ثواب تو مل جائے گا؛ لیکن اللہ کا قرب حاصل نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا تقویٰ کے حصول کے لیے فکر ہونی چاہیے، تقویٰ میں اضافہ کے لیے دعائیں ہونی چاہیے اور اہلِ تقویٰ کی صحبت میں رہنے کا اہتمام ہونا چاہیے کہ یہی حصولِ تقویٰ کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔

☆☆☆

درسِ عقائد

اللہ پاک ذات وصفات میں بے مثل ہیں

قسط (۳)

ضبط وترتیب: مفتی سیف اللہ قاسمی صاحب

"ایمان" اس دنیا کی سب سے قیمتی متاع اور بے مثل خزانہ ہے، ایمانیات میں عقیدۂ توحید بنیادی درجہ رکھتا ہے، اللہ پاک اپنی ذات میں بھی یکتا اور بے مثال ہیں اور صفات میں بھی۔ اسی لیے اہل السنّۃ والجماعہ کا متفقہ عقیدہ ہے کہ اللہ پاک اپنی ذات، صفات اور افعال میں لامثیل ولامثال ہے، کوئی چیز ان جیسی نہیں۔

قرآن عظیم الشان میں فرمایا گیا: لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ (سورۃ الشوریٰ، آیت: ۱۱)

ترجمہ: "ان جیسی کسی چیز کا وجود ہی نہیں ہے۔"

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا کما حقہ ادراک ممکن نہیں؛ کیوں کہ ان کا نہ تو کسی محسوس چیز سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، اور نہ کسی معقول چیز سے سمجھا جاسکتا ہے، ان کی شانِ عالی: لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَّھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ہے یعنی نہ ذات میں ان کا کوئی مماثل ہے نہ صفات میں، وہ سمیع وبصیر بے شک ہیں، مگر ان کا دیکھنا سننا مخلوق کے دیکھنے سننے کی طرح نہیں ہے، کمالات ان کی ذات میں بے شمار ہیں؛ مگر کوئی کمال ایسا نہیں جس کی کیفیت بیان کی جاسکے؛ کیوں کہ ان کی نظیر موجود نہیں، وہ مخلوق کی مشابہت ومماثلت سے بالکلیہ پاک اور مقدس ومنزّہ ہیں۔ چوں کہ انسان کے معقولات بھی تمام تر محسوسات سے مستفاد ہوتے ہیں؛ نیز وہ محسوسات سے پوری طرح بلند ہوکر نہیں سوچ سکتا، اس لیے حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے کما حقہ ادراک کی کوئی صورت ہی نہیں۔

(رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ، ج:۱، ص: ۲۳۳ تا ۲۵۵)

استاذ المعہد العالی الاسلامی پلمنیر

الغرض آیت کا خلاصہ صرف اتنا ہی سمجھ لیں کہ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا: فَهُوَ سُبْحَانَ اللهِ تَعَالٰى عَمَّا يُدْرِكُهُ الْعَقْلُ وَالْوَهْمُ، بَلْ هُوَ وَرَاءَ الْوَرَاءِ، ثُمَّ وَرَاءَ الْوَرَاءِ، ثُمَّ وَرَاءَ الْوَرَاءِ

ترجمہ: ''اللہ پاک اس سے پاک ہیں جس کو عقل اور وہم پا سکیں؛ بلکہ وہ 'وراء الوراء' ہیں، پھر اس سے بھی وراء، پھر اس سے بھی وراء''۔

گویا امام ربانیؒ فرما رہے ہیں:

تم اللہ پاک کے بارے میں جتنا سوچو، جتنا بولو، جتنا پڑھو، جتنا لکھو اور جتنا بھی کسی بھی اعتبار سے تم آگے غور کرتے جاؤ اللہ پاک اس سے آگے ہیں؛ یہاں تک کہ تمہاری سوچ ختم ہو جائے گی؛ لیکن اللہ پاک کا صحیح معنوں میں ادراک پھر بھی تم نہیں کر پاؤ گے، اللہ پاک اس سے بھی ماوراء ہیں۔

حضرت امام ربانیؒ کے اس ارشاد کا خلاصہ یہ نکلا کہ: اللہ پاک عقل اور وہم سے ماوراء، خیال اور تصور سے ماوراء ''ماوراء'' کے تصور سے بھی ماوراء ہیں؛ لیکن قریب اتنے ہیں کہ اللہ پاک خود فرماتے ہیں: نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (سورہ ق، آیت: ۱۶) ترجمہ: ''اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں''؛ لیکن اللہ کی معرفت پانے کے لیے مسافت اتنی کہ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

صفاتِ مشترکہ بظاہر مشترک ہیں لیکن حقیقۃً مختلف

دوسری بات یہ ہے کہ چند صفات اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان بہ ظاہر مشترک ہیں جیسے آیتِ بالا میں اللہ پاک اپنے بارے میں فرماتے ہیں: وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ کہ اللہ پاک سنتے ہیں اور دیکھتے ہیں۔ اسی طرح انسان کے متعلق اللہ پاک نے فرمایا: فَجَعَلْنَاهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا کہ ہم نے انسان کو سننے والا اور دیکھنے والا بنایا ہے۔

نیز اللہ پاک کریم ہیں، مخلوق بھی کریم ہے؛ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ پاک کے جو صفاتی نام ہیں ان کا ترجمہ وہ نہیں ہوگا جو ترجمہ ہم مخلوق کے لیے کرتے ہیں؛ چناں چہ انسان کے لیے ''کریم'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے صرف یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ شریف اور سخی آدمی ہے؛ لیکن وہ انسان اللہ کا مثل نہیں ہوگا یا اللہ ویسے کریم نہیں ہیں، جیسے بندہ کریم ہے کہ دس بار بندے سے مانگو تب بندہ اپنی سخاوت دکھائے گا۔

اللہ پاک کیسے کریم ہیں؟

اَلْكَرِيْمُ هُوَ الَّذِيْ يُعْطِيْ بِدُوْنِ الْمِنَّةِ وَالْاِسْتِحْقَاقِ یعنی اللہ پاک ایسے کریم ہیں جو بغیر

احسان جتائے اور بغیر استحقاق بے حساب عطا فرمانے والے ہیں؛ بلکہ بندوں کی خطاؤں کے باوجود انہیں نوازتے رہتے ہیں۔

اللہ پاک کیسے دیکھنے اور سننے والے ہیں؟

لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ (سورۂ بقرہ، آیت: ۲۵۵)

ترجمہ: ''اللہ پاک کو نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند'' کیا انسان ایسا دیکھتا ہے؟ ظاہر ہے ایسا تو نہیں ہے۔ کتنی ہی دوری پر کوئی ہلکی سی آواز بھی ہو، اللہ پاک اسے بھی سن لیتے ہیں، کالے پہاڑ پر کالی چیونٹی کی حرکت بھی اللہ پاک دیکھتے ہیں اور اس کی آواز کو بھی سنتے ہیں۔ تو کیا انسان اس طرح دیکھتا اور سنتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا تو نہیں ہے۔

اللہ پاک کیسے قدیر ہیں؟

اسی طرح اللہ پاک کا ایک صفاتی نام "قدیر" ہے اور بندے کو بھی قدیر اور قادر کہتے ہیں؛ لیکن کیا بندے میں ویسی قدرت ہے جیسے اللہ پاک میں ہے؟ اللہ پاک کیسے قدیر ہیں؟ اَلْقَدِیْرُ هُوَ الَّذِیْ لَا یُعْجِزُهٗ عَنِ اسْتِعْمَالِ قُدْرَتِهٖ شَیْءٌ

ترجمہ: اللہ پاک ایسے قدیر ہیں کہ جنہیں اپنی قدرت کے استعمال سے کوئی چیز عاجز نہیں کرسکتی، اگر اللہ پاک اپنی قدرت کا استعمال فرمانا چاہیں تو کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ کیا انسان کے پاس ایسی قدرت ہے؟ کیا انسان ایسا قدیر اور قادر ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا تو نہیں ہے۔

(اسی مضمون کو علمی انداز میں اس طرح بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتی، دائمی، قدیم اور لامحدود ہیں؛ جب کہ بندے کی صفات عارضی، عطائی، حادث، زوال پذیر اور محدود ہیں؛ چناں چہ انسان کی سماعت (سننا) اور بصارت (دیکھنا) حادث ہے اور اللہ پاک کی سماعت (سننا) اور بصارت (دیکھنا) قدیم ہے، انسان کی سماعت اور بصارت کا زوال (ختم ہونا) ممکن ہے اور اللہ پاک کی سماعت اور بصارت کا زوال ممتنع یعنی محال ہے۔)

خلاصہ یہ کہ اللہ پاک کی ذات کے مثل کوئی چیز نہیں ہے، ان کی صفت کے مثل کوئی صفت نہیں ہے اور ان کے فعل کے مثل کسی کا فعل نہیں ہے، سمیع، بصیر، کریم اور قدیر وغیرہ الفاظ ایک جیسے ہیں؛ لیکن ان کے معنیٰ اور مصداق میں کئی اعتبارات سے فرق ہے۔

اَکابِر شناسی

سلسلہ نمبر (۳)

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلہ کی پرواہ

ابو سید محمد اللہ غوری

دار العلوم دیوبند، ایسا باعظمت اور بابرکت ادارہ ہے کہ جس کی بنیادیں خلوص و وفا کے سرچشمے سے سیراب ہیں تو بام و در، للّٰہیت کے قیمتی ہیروں سے مزیّن۔ اسی لیے شاعر نے اسے اخلاص کے تاج محل سے تشبیہ دی۔

آج کی صحبت میں آسمانِ دار العلوم کے ایک ایسے ہی روشن ستارے کا تذکرہ مقصود ہے، جس کی پُرخلوص شعاعوں سے اپنے وقت کا ماحول منور تھا اور جس کی پُرتاثیر کرنوں سے دار العلوم کے در و دیوار فیض یاب تھے۔

"ایسی عظیم ہستی حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی ہے۔"

آپ حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے خلف الرشید، مفتی اعظم مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی اور علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے برادر اکبر اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جیسے فقیہ النفس اور قطب الاقطاب کے تربیت یافتہ، دست گرفتہ اور خادمِ خاص تھے۔ (لالہ وگُل)

حسب و نسب کی ان اعلیٰ شرافتوں اور نسبتوں کے ساتھ خدا تعالیٰ نے آپ کو علم و فضل کی دولت سے بھی نوازا تھا۔ چناں چہ آپ کو ادب بالخصوص عربی ادب میں کمال حاصل تھا۔ عربی کے تین سو اشعار کا قصیدہ لامیۃ المعجزات (جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک سو معجزے بیان کیے گیے ہیں) آپ کے عربی ادب کے اعلیٰ ذوق کے گواہ ہیں اور اس کے ساتھ پانچ سو صفحات پر مشتمل کتاب "اشاعتِ اسلام" فنِ تاریخ سے آپ کے شغف کی ایک مثال! (حیاتِ عزیز)

پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو دانش مندی، تدبر وفہم اور انتظام وانصرام کی بھی عجیب وغریب صلاحیتوں سے نوازا تھا اور ان سب کے ساتھ "رجال شناسی ورجال سازی" کا بھی غیر معمولی جوہر اپنے اندر رکھتے تھے۔ لکھا ہے کہ اس وقت کے دارالعلوم میں یگانۂ روزگار افراد تھے، یکتا اور بے نظیر! اور ان ہمہ اقسام کے گلوں کو ایک گلدستہ میں سجانے میں بھی آپ ہی کا بڑا دخل تھا۔ (لالہ وگل)

۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء میں جب دارالعلوم کے مہتمم خامس حضرت حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (فرزندِ رشید حضرت نانوتوی قدس سرہ) کو اپنے اسفار اور کثرتِ مصروفیات کے باعث ایک چست منتظم اور فعّال معاون کی ضرورت پیش آئی تو اس وقت کے اکابر نے مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانیؒ ہی کا انتخاب کیا؛ چناں چہ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ "یہ دارالعلوم کی خوش قسمتی ہے کہ اسے مولانا عثمانیؒ جیسا بیدار مغز منتظم اور مخلص ہاتھ آ گیا۔ اہتمام کے کاموں سے ان کو اس قدر شغف تھا کہ شب وروز کا بیش تر حصہ اسی میں صرف ہوتا تھا؛ حتیٰ کہ ان کی سکونت بھی دارالاہتمام ہی میں تھی اور ان کی وفات بھی اسی میں ہوئی۔ انہوں نے دارالعلوم کے شعبۂ انتظام وانصرام کو اتنا منظم ومستحکم کر دیا تھا کہ جب حکومتِ آصفیہ کی طرف سے نواب صدر یار جنگ بہادر دارالعلوم کے حسابات کی تنقیح کے لیے دیوبند آئے تو ان کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ایک ایک اور دو دو آنے تک کے حسابات کے کاغذات اور رسیدیں باضابطہ طور پر فائل میں موجود تھیں۔ نواب صدر یار جنگ کا بیان ہے کہ کوئی کاغذ ایسا نہ تھا جو مانگا گیا ہو اور فوراً ہی پیش نہ کر دیا گیا ہو"۔ (حیاتِ عزیز)

لیکن ان تمام کاموں کے باوجود اس نیک طینت انسان کے دل میں نہ نام ونمود کی خواہش تھی، نہ ہی شہرت کی کوئی کوشش۔ بس سچی خدا طلبی، حقیقی دیانت داری، اور واقعی بے لوثی!

چناں چہ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن" میں ان کی اِس للّٰہیت کو جس انداز میں سراہا ہے ذرا ملاحظہ فرمائیں۔ اپنے داخلے کا واقعہ کچھ اس انداز میں لکھتے ہیں کہ "داخلہ کے لیے اس وقت کے مہتمم حافظ احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام ایک خط لکھا، فوراً ہی جواب موصول ہوا کہ بہ جلد دیوبند پہونچ جاؤ، ہر چیز کا نظم کر دیا جائے گا، یہ ایک پوسٹ کارڈ تھا جس پر حضرت حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دستخط تھے۔ چناں چہ دیوبند پہونچنے کے بعد جس ہستی سے ملاقات کے لیے دل بے چین تھا، وہ حافظ صاحب کی ذات گرامی ہی تھی، اپنے ہم وطن دارالعلوم کے قدیم طالب علم، حکیم منظر صاحب سے اپنا عندیہ ظاہر کیا، تو وہ ایک دارالمشورہ میں لے گئے، جہاں نحیف ونا تواں شخص بیٹھا تھا، جب ان کی خدمت میں حاضری ہوئی تو پتہ چلا کہ یہ حافظ احمد صاحب نہیں؛ بلکہ مولانا حبیب الرحمن صاحب ہیں۔ حافظ صاحب

مدرسہ کے گلِ سرسبد ہیں اور باہر کی دنیا ان ہی کے نام سے مدرسہ کو پہچانتی ہے؛ لیکن مدرسہ کے سارے اندرونی انتظامات اسی نحیف ونزار، سراپا اخلاص، مطلق راست بازی کی چشم وابرو کے اشاروں سے وابستہ ہیں۔

اب آگے رئیس القلم، مورخ ومتکلم حضرت مولانا گیلانیؒ کا تبصرہ ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں: "اللہ اللہ کیا ٹھکانہ ہے اس سچائی اور بے ریا زندگی کا کہ سارے کام جو انجام دے رہا تھا، مجھ جیسا آدمی جو بہر حال عربی تعلیم کے دائرے ہی کا آدمی تھا، اس ملاقات سے پہلے، اس کے نام سے بھی شاید ناواقف تھا، ستر واخفاء کی یہ ایک اتنی غیر معمولی مثال تھی کہ دل دیر تک اس کو سوچتا رہا۔" (احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن)

سچ ہے کہ ہمارے اکابر واسلاف (جن کے ہم پیروکار اور متبع ہیں) سچے خدا پرست تھے۔ واقعی مخلص اور دین کے بے لوث خادم تھے۔ وہ صرف کام چاہتے تھے اور اسی کے دھنی تھے۔ نمود وریا سے کوسوں دور رہتے تھے اور شہرت پسندی اور منصب طلبی سے متنفر اور بیزار۔ ان کے پیش نظر صرف اور صرف دین کی خدمت ہوتی تھی اور مقصد محض رضائے خداوندی کی تحصیل۔ اس کے سوا کسی چیز پر نہ ان کی نظر تھی، نہ انہیں اس سے کوئی سروکار تھا۔

اور یہی وہ بات ہے جس کی قرآن کریم میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے تئیں بار بار گواہی دی گئی کہ وہ امت کے بے لوث خادم تھے، مخلوق سے کسی بھی قسم کے صلہ کے خواستگار تھے، نہ ہی اپنی خدمات پر بدلہ کے طلبگار۔ ان کی کل محنت بے غرض اور مخلصانہ ہوتی تھی۔ ان کے تعارف میں متعدد مقامات پر یہ صریح الفاظ ہیں:

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ (سورۃ الشعراء، آیت: ۲۶، ۱۰۹، ۱۲۷، ۱۴۵، ۱۶۴، ۱۸۰) ترجمہ: "اور میں تم سے اس (تبلیغِ دین) پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، میرا اجر تو بس تمام جہانوں کے رب کے ذمہ ہے۔"

اس دنیا میں تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو کام کرتے ہیں اور کام ہی ان کا مقصدِ حیات ہوتا ہے۔ چناں چہ انہیں اپنے کام پر نہ ستائش کی تمنا ہوتی ہے اور نہ صلہ کی پرواہ۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو درخت لگاتے ہیں اور بھول جاتے ہیں، نہ پھل کے امیدوار نہ اجرت کے خواستگار!

دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جو کام پر بدلہ کے طلبگار ہوتے ہیں اور اپنا حق الخدمت چاہتے ہیں؛ لیکن تیسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو کام کے بجائے نام چاہتے ہیں۔ گویا شہرت اور ناموری کے طلبگار۔ پہلے لوگ سچے ہوتے ہیں اور ایسے ہی افراد کی برکت سے کسی بھی تحریک کا وجود اور بقا ہوتا ہے؛ بلکہ اس کی ترقی ہوتی رہتی ہے، اس کے بالمقابل دوسری قسم کے لوگ اپنے فائدے کے حصول تک کام اور تحریک سے جڑے رہتے

ہیں، جوں ہی ان کے مفادات پر ضرب پڑتی ہے تو ان کی زبان سے سلام الوداع نکل جاتا ہے؛ لیکن تیسری قسم کے لوگ شہرت پسند اور جاہ طلب ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہ کام کے بجائے نام پر ہوتی ہے اور وہ ناموری کے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں، اور ایسے مواقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ایسے لوگ "غیر واقعی" کو "واقعی" بتانے میں ماہر یا "کم کو زیادہ دکھانے میں فنکار ہوتے ہیں"۔ ظاہر ہے کہ پہلے طبقے کے افراد اپنے ذاتی مفادات کی قربانی دیتے ہیں تو اداروں اور تحریکوں کو زندگی ملتی ہے اور انہیں پائندگی نصیب ہوتی ہے اور دوسری اور تیسری قسم کے لوگ اپنے مفادات کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے، جس کے سبب زندہ ادارے اور تحریکیں بھی وقت گذرتے یا تو دم توڑ دیتی ہیں یا پھر ان کی افادیت کا دائرہ رفتہ رفتہ سمٹتا اور تنگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے تابناک ماضی کے پیچھے دراصل حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جیسے متعدد گمنام، بےلوث اور مخلص افراد کی بےشمار قربانیاں ہیں، جس کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا میں اس ادارہ کا نام روشن ہے اور وہ پوری ملت اسلامیہ کے دلوں کی دھڑکن ہے۔ ان بابرکت اور مخلص نفوس گرامی کی زندگیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو بےاختیارانہ یہ دعا زبان پر آتی ہے کہ الٰہی! ہمیں بھی ان مخلص افراد کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیے۔ (آمین)

☆☆☆

تعارفِ کُتُبِ تَصوّف

سلسلہ نمبر (۳)

مکتوباتِ فقیر

مکتوبات نگار : محبوب العلماء والصلحاء حضرت مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی قدس سرہ

صفحات : ۱۵۶

تعارف نگار : مفتی محمد عمران قاسمی کورٹلوی

اہلِ علم ودانش کے "خطوط" عموماً کاتب ومکتوب الیہ کے درمیان ربطِ باہمی کا خوب صورت استعارہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھار وہ باتیں جو سرِ عام نہیں کہی جاسکتیں، خطوط کی زبان میں جلوہ گر ہوتی ہیں، اسی طرح وہ حرفِ راز بھی کہ صلائے عام بننا جس کا مقدر نہیں ہوتا، خطوط کی راہ سے مخاطب تک پہنچتا ہے اور یوں رازہائے سربستہ کو نسبتِ انتقال ملتی ہے۔

خطوط کا دامن بہت وسیع ہے۔ ان میں بے تکلفی اور برجستگی کے خوب صورت نمونے بھی ہیں اور بیانِ مُدّعا کے دل نشیں طریقے بھی، درخواستوں اور سفارشوں کا انبار بھی ہے اور حاجتوں وضرورتوں کا اظہار بھی، خطوط کی اسی صِنف میں بیانِ حال اور پرسشِ احوال کے ساتھ ساتھ علم، ادب، اخلاق، تاریخ، سیاست اور معلومات کے قیمتی جواہر پارے بھی ملتے ہیں اور نادر افکار وخیالات، سچے جذبات وتاثرات اور قلبی احساسات وواردات کے بیش بہا موتی بھی۔ چناں چہ شدہ شدہ جب لوگوں تک ایسے عمدہ وقیمتی نجی خطوط کی اطلاع پہنچتی ہے تو دل ان کے شوقِ دید سے بے تاب ہوجاتے ہیں، پھر زبانیں ان کے مفید مضامین سے آگاہی کے لیے طباعت کے تقاضے کرتی ہیں اور یوں خطوط کے لیے "ذاتیات کے محدود دائرے" سے آگے بڑھ کر "عمومی افادیت کی وسیع راہیں" ہموار ہوتی ہیں۔

چناں چہ علمی وادبی نکات، سماجی و معاشرتی تعلیمات، سیاسی وتہذیبی بیانات اور اصلاحی واخلاقی ہدایات پر مشتمل خطوط و مکاتیب کی سیکڑوں کتابیں اسی راہ سے منظر عام پر آئیں۔ عربی زبان میں: جاحظ کے ادبی پیامات، فلسفیانہ افکار اور معاشرتی موضوعات پر خطوط ورسائل کا مجموعہ "رَسائلُ الجاحِظِ" اور ابن حزم اندلسیؒ کے دینی وفکری مضامین کا مجموعہ "الرسائل الکبری"، فارسی زبان میں: حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے دقیق علمی مضامین پر مشتمل مکتوبات بعنوان "قاسم العلوم"، اسی طرح اردو زبان میں: مرزا اسد اللہ خاں غالب کی سادگی، بے تکلفی اور برجستگی کے اعلیٰ نمونوں پر مشتمل ادبی نثر کا مجموعہ "غالب کے خطوط"، مولانا ابوالکلام آزادؒ کی مشہورِ زمانہ "غبارِ خاطر" اور "مکاتیبِ ابوالکلام آزاد" علامہ شبلی نعمانیؒ کی "مکاتیبِ شبلی"، ادیب شہیر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی "خطوطِ ماجدی" علامہ سید سلیمان ندویؒ کی "برید فرنگ" مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی "مجموعۂ خطوطِ گیلانی" مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی "مکاتیبِ مولانا عبیداللہ سندھی" شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی "مکتوباتِ شیخ الاسلام"، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور ان کے مسترشد مولانا دریابادیؒ کے درمیان ہونے والی مکاتبت کی مربوط قلمی داستان "حکیم الامت۔نقوش وتاثرات" اور ماضی قریب میں مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ کی "حدیثِ دوستاں" اور "اعجاز نامے" وغیرہ اسی کی مثال ہیں۔

ان سب کے سوا خطوط کی تاریخ میں انتہائی قابلِ ذکر پہلو ایک یہ بھی ہے کہ مشائخِ طریقت اور اصحابِ نسبت صوفیاء کرام نے بھی مکتوبات کو تزکیۂ نفس، اصلاحِ باطن، مردُم سازی اور انسانیت گری کے لیے بہترین وسیلے کے طور پر استعمال کیا۔ چناں چہ فارسی زبان میں: حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کی معروف زمانہ "مکتوبات صدی"، حضرت امام ربانی مجددِ الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی فاروقی قدس اللہ سرہ کی "مکتوباتِ امام ربانی"، آپ کے نامور فرزندِ عالی قدر عروۃ الوثقیٰ حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب قدس سرہ کی "مکتوباتِ معصومیہ" اور حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلویؒ کے "مکاتیب شریفہ" اور دورِ آخر میں بہ زبانِ اردو: سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی "مکتوبات امدادیہ" اور "المرقومات الامدادیہ"، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی "تربیت السالک" اور "مکتوباتِ حکیم الامت" علامہ سید سلیمان ندویؒ کے نام ان کے شیخ و مربی حضرت تھانویؒ کے اصلاحی وعرفانی خطوط کا مجموعہ "مکاتبتِ سلیمان" اور علامہ شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی وعرفانی واصلاحی خطوط بنام "مکتوبات افغانی" اس باب میں نہایت اہم، مفید، چشم کشا اور بصیرت افروز ہیں۔ کہنا چاہیے کہ مشائخ کرام کے ان مکتوباتِ شریفہ میں قرآن و حدیث کے قیمتی علوم و معارف، توحید و رسالت کے اسرار و رموز، دنیا کی حقیقت، نفس کے مکائد کی تفصیل اور اللہ کا قرب پانے کی

نہایت سہل اور عمدہ تعلیمات مذکور ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر قاری صدقِ دل اور نیک نیتی سے ان کتابوں کا مطالعہ کرے تو وہ خود محسوس کرے گا کہ آن کی آن میں اس کے دل کی دنیا تبدیل ہورہی ہے۔ اس کے دل میں سنتِ مطہرہ پر چلنے کا شوق پیدا ہوگا، بدعات سے نفرت طبیعت کا حصہ بن جائے گی، بزرگانِ دین کی محبت اور ان کے پاکیزہ طریقے کی اہمیت اس کے دل میں پیدا ہوگی اور وہ ان مکاتیب کی غیر معمولی تاثیر کے سبب گناہوں بھری زندگی سے چھٹکارا پانے اور قربِ الٰہی کی نعمت پانے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ پائے گا۔

اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہمارے حضرت جی (محبوب العلماء والصلحاء حضرت جی مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی مجددی) قُدِّسَ سِرُّہٗ کی کتاب "مکتوباتِ فقیر" بھی ہے۔

مکتوباتِ فقیر کے ہر ایک مکتوب میں قارئین کرام کو صاحبِ مکتوبات کا سوزِ دروں محسوس ہوگا، اس کے ہر صفحہ میں دلِ دردمند کی آواز، قلبِ مضطر کی صدائے دلنواز اور روحِ بے قرار کا ساز سنائی دے گا۔ اس کتاب کی غیر معمولی تاثیر کی وجہ سے یہ کہنا بجا ہوگا کہ کتاب کے مطالعے کے دوران قاری پر عجیب عجیب کیفیتیں طاری ہوں گی۔ کسی مکتوب کا مطالعہ اپنے ماضی پر ندامت کے آنسو بہانے پر مجبور کرے گا تو کوئی مکتوب مستقبل کے حوالے سے حوصلہ بخش اور امید فزا ثابت ہوگا۔ ان مکتوبات میں قرآنی ارشادات بھی ہیں اور نبوی ہدایات بھی، زندگی کی قدردانی کے اسباق بھی ہیں اور آخرت میں باز پُرسی کی یاددہانی بھی، حسنِ اخلاق وحسنِ معاشرت کی تعلیمات بھی ہیں اور صاحبِ مکتوبات کی زندگی کے قیمتی تجربات بھی۔ اگر یہ بات سچ ہے کہ کسی بھی شخص کے مکتوبات اس کے افکار کے ترجمان اور ذوق کے آئینہ دار ہوتے ہیں تو یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ صاحبِ مکتوبات حضرت جی قدس سرہ کی فکر، ذوق، افتادِ طبع اور مزاج و مذاق صرف اللہ تعالیٰ کی پاکیزہ ہستی کے گرد محوِ طواف رہا۔ اس لیے کہ اس کتاب کے ہر مکتوب کا مرکزی نکتہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اس میں محض "اللہ" کی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۳۷ رمکتوبات میں سے ہر ایک مکتوب کا آغاز "اللہ اللہ اللہ" سے ہے اور اختتام كَانَ اللّٰهُ لَهٗ عِوَضًا عَنْ كُلِّ شَيْءٍ (اللہ تعالیٰ مکتوب نگار کے لیے ہر چیز کی طرف سے بدل ہوجائے) والے دعائیہ جملے پر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان مکتوبات میں محض اللہ سے جڑنے کی اور سچی بندگی اختیار کرنے کی شفقت آمیز تلقین ہے اور اپنے رب سے کیے ہوئے عہدِ غلامی کو پورا کرنے کی دردمندانہ تاکید!

قیمتی مکتوبات میں سے چند اقتباسات بطورِ نمونہ ملاحظہ ہوں:

مکتوب نمبر (۱) میں رقم طراز ہیں:

"جب تک قلب ناز یبا حرکتوں سے باز نہ آئے، اس میں دقائق و اسرار سمجھنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔

جس طرح چراغ جلے بغیر روشنی نہیں دیتا، علم بھی عمل کے بغیر فائدہ نہیں دیتا۔ حضرت لقمان حکیمؒ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی "میں نے بڑے بڑے پتھروں اور لوہے کے ٹکڑوں کو اٹھایا مگر دین سے زیادہ وزنی کسی چیز کو نہیں دیکھا"۔

مکتوب نمبر: ۲ میں لکھتے ہیں:

"آسمان کی زینت ستاروں سے ہے اور زمین کی زینت پرہیزگاروں سے ہے۔ پرہیزگاری کہتے ہیں ہر اس چیز کا ترک کر دینا جس کے اختیار کرنے سے تعلق باللہ میں فرق آئے۔ بعض اکابرین نے فرمایا کہ پرہیزگاری یہ ہے کہ انسان کی دلی تمناؤں کو مجسم کر کے ایک طشتری میں ڈالیں اور سرِ بازار پھرائیں تو کوئی ندامت کا پہلو نہ نکلے۔"

ذکرِ الٰہی کی اہمیت کو بتاتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: "ذکر کے ساتھ طبعی مناسبت کا پیدا ہونا ایک نعمتِ عظمیٰ ہے، جو اس زمانے میں کمیاب؛ بلکہ نایاب ہوتی جارہی ہے۔ عوام الناس کا تو کیا کہنا، خواص بھی اس سے تہی دامن ہوتے جارہے ہیں۔ ذکرِ الٰہی سے محبتِ الٰہی نصیب ہوتی ہے، جب کہ محبتِ الٰہی اور خشیتِ الٰہی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔" آگے لکھتے ہیں: "طالبِ صادق مصروفیت کے اوقات میں وقوفِ قلبی اور فرصت کے اوقات میں مراقبہ کرنے سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ بقول شخصے:

جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

عشق و مستی کا یہ جذبہ فنافی اللہ اور بقاباللہ کے مقامات تک پرواز نصیب ہونے کا موجب بنتا ہے۔"

(مکتوب نمبر: ۴)

مکتوباتِ فقیر میں جا بہ جا قیمتی نصیحتیں ہیں اور اس پر مستزاد صاحبِ مکتوبات کا نصیحت کرنے کا دلنشیں، دل آویز اور خوب صورت انداز ہے۔

دل آویز اسلوب میں چند بہترین نصیحتیں ملاحظہ فرمائیں:

مکتوب نمبر: ۸ میں رقم طراز ہیں:

"عزیزم! زندگی ایک ہیرا ہے، اسے تراشنا اور چمکانا انسان کا کام ہے۔ ہر معاملے میں شریعتِ مطہرہ کی اتباع سے قلب مصفّٰی اور مجلّٰی ہو جاتا ہے۔ باطن کی صفائی گناہوں سے بچنے کے متناسب ہوتی ہے، اپنے آپ کو اس معیار پر پرکھیں اور کمی بیشی پائیں تو ندامت و شرمساری کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہوں کہ آنکھوں کی

برسات، دلوں کو پاکیزہ بنا دیتی ہے۔"

ایک صاحب کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''جس کے اخلاق درست نہیں، اسے تصوف میں سے کچھ حصہ نہیں ملا۔ آپ ہر کام میں مثبت سوچ کو اپنایا کریں۔ جس پھول کے رس کو شہد کی مکھی شہد میں تبدیل کرتی ہے مکڑی اسی رس کو زہر میں تبدیل کرتی ہے۔ نصیب اپنا اپنا۔ عیاری و مکاری سے کوسوں دور بھاگیں، اس لیے کہ عیاری چھوٹے کمبل کی مانند ہے، انسان اس سے سر چھپائے تو پاؤں ننگے ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ الوسع دوسروں کی خیر خواہی کریں۔ "اَلدِّیْنُ النَّصِیحَۃُ" آپ نے سنا ہوگا۔ انسانوں کو جنگل کے درندوں نے اتنا نقصان نہیں پہونچایا، جتنا خود انسانوں نے پہونچایا ہے۔ اگر کوئی آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے تو آپ اس کے راستے میں کانٹے نہ بچھائیں؛ ورنہ ساری دنیا میں کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے۔ یاد رکھیں! صندل کا درخت اس کلہاڑے کے منہ کو بھی خوشبودار بنا دیتا ہے جو اسے کاٹتا ہے۔ عاجزی وانکساری کا سہارا لیکر چلیں ورنہ ٹھوکر کھا کر گر جائیں گے۔'' (مکتوب نمبر:۹)

مکتوباتِ فقیر میں ہمیں نصیحت وموعظت کے قیمتی کلمات کے ساتھ اُردو ادب کے بہترین جواہر پارے بھی جا بہ جا ملتے آتے ہیں۔ اس حوالے سے درج ذیل چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

" تصوف دل کی صفائی کا نام ہے۔ روشن دل وہ ہے جس میں خَلق نہ ہو اور سیاہ دل وہ ہے جس میں خُلق نہ ہو۔ بیماریوں میں سب سے بری، دل کی بیماری ہے اور دل کی بیماریوں میں سب سے بری، دل آزاری ہے۔ تصوف کا اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ اپنے دل پر غم برداشت کر کے بھی دوسروں کے دلوں کو خوشی پہنچاؤ اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اگر دوسروں کو خوشی نہیں پہونچا سکتے تو کم از کم ان کے دل کو ایذا نہ پہونچاؤ۔ جو انسان زمین کا سفر کرے، اس کے پاؤں پہ آبلے پڑتے ہیں اور جو انسان روحانی دنیا کا سفر کرے اس کے دل پہ آبلے پڑتے ہیں"۔ "آپ یہ بات پلے باندھ لیں کہ دل سیاہ ہو تو چمکتی آنکھیں کچھ فائدہ نہیں دیتیں۔"

آگے اسی مکتوب میں عجب، تکبر اور ریاکاری کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اپنے آپ کو عظمت اور دوسروں کو حقارت سے دیکھنے کا نام عجب ہے، نصیحت کو ماننے کی طرف طبیعت کا مائل نہ ہونا اور اپنی باتوں کی تردید پر رنجیدہ ہونا کِبر ہے اور اللہ تعالیٰ کی نسبت، لوگوں کو عزیز رکھنا ریاکاری ہے۔ اگر آپ ان تینوں میں سے کوئی علامت اپنے اندر محسوس کریں تو اسے خطرے کی گھنٹی سمجھیں۔ توبہ واستغفار کی مدد سے دل کی سیاہی دھویا کریں۔" عزیزم! شہوات کے پورا کرنے میں مگن رہنا اور خواہشاتِ نفسانی کی اتباع کرنا دل کے سیاہ ہونے کی دلیل ہے۔ یاد رکھیں کہ شہوت وہ شیرینی ہے جو چکھنے والے کو ہلاک کر دیتی ہے جب کہ خواہشِ نفس انسان کو طائر

فی القفس بنا دیتی ہے۔خواہش پہ غالب آنا فرشتہ صفت بننا ہے اور مغلوب ہونا چوپایوں کی صفت ہے۔"

(مکتوب نمبر:۲۰)

اسی طرح مکتوب نمبر ۷ میں نصیحت پر مشتمل یہ ادبی شہ پارہ ملاحظہ فرمائیں:"عزیزِ من! جمال لایزال کے دیوانے تو روحِ بلالی اور تلقینِ غزالی کے حامل اور پیچ و تاب رازی اور سوز وساز رومی کے وارث ہوا کرتے ہیں"۔

اسی طرح صاحبِ مکتوبات (حضرت جی قدس سرہ) کے قیمتی تجربات و مشاہدات پر مشتمل نصیحت کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔ لکھتے ہیں:"یاد رکھیں کہ محنتی کے لیے پہاڑ بھی کنکر ہے اور سست کے لیے کنکر بھی پہاڑ ہے۔ اگر پہاڑ کو سرکانا چاہتے ہو تو پہلے ذروں کو سرکانا سیکھو۔جس طرح دنیا کا سب سے لمبا سفر ایک قدم اٹھانے سے شروع ہوجاتا ہے اسی طرح آپ کی پریکٹیکل لائف پہلے دن کام پر جانے سے شروع ہوچکی ہے۔کمزور انسان موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں جب کہ باہمت انسان مواقع پیدا کرلیا کرتے ہیں۔کبھی کوئی ناخوش گوار بات پیش آجائے تو پریشان نہ ہوجانا۔چوں کہ کامیابیوں کا زینہ ناکامیوں کے ڈنڈوں سے مل کر تیار ہوتا ہے۔کسی حالت میں اپنے دل کو گرنے نہ دینا کہ لوگ گرے ہوئے مکان کی اینٹیں بھی اٹھالیا کرتے ہیں۔عزیزم! یہ بات پلے باندھ لینا کہ راستے میں پڑا ہوا بھاری پتھر کمزور کے لیے رکاوٹ بن جاتا ہے جب کہ طاقتور اس پر پاؤں رکھ کر گزر جاتا ہے۔ یہ ہمت ہی تو تھی جس نے گڈریے کو نادر شاہ اور معذور کو تیمور لنگ بنا دیا تھا۔اپنے کام میں مہارت پیدا کروگے تو عزت ملے گی، آپ کے ہم پیشہ آپ کی قدر کریں گے۔جس طرح پست گدھے پر ہر کوئی چڑھ جاتا ہے اسی طرح نالائق شخص پر سب حکومت کرتے ہیں۔وقت کی قدر کرنا، وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا بلکہ دولت، وقت اور ہوا ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔" (مکتوب نمبر:۵۱)

مکتوباتِ فقیر، کہنا چاہیے کہ راہِ سلوک کے بارے میں قیمتی تعلیمات، ارشادات اور ہدایات سے آراستہ ایک حسین ترین گلدستہ ہے۔ذیل میں متعدد مکتوبات سے چند اہم اقتباسات بطور نمونہ پیش کیے جارہے ہیں۔

لکھتے ہیں کہ

"عزیزم! جب تک ذکر میں فنا فی اللہ اور بقا باللہ کے مقامات نصیب نہ ہوجائیں، احوال میں پختگی نصیب نہیں ہوتی۔شیطانی وساوس کو سمجھنا اور ان سے بچ نکلنا مشکل ہوتا ہے۔نامحرم عورت یا امرد پر ارادۃً نظر کرنا کبیرہ گناہ ہے جس سے عام طور سے عقلِ سلیم چھن جاتی ہے" (مکتوب نمبر ۲۵)

مکتوب نمبر ۲۸ میں ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ "عزیزم! آپ چوتھی سیڑھی پر کھڑے ہیں، ایک دم دسویں، گیارہویں، بارہویں، تیرھویں سیڑھی پر چڑھنے کے لیے چھلانگ لگائیں گے تو نیچے گریں گے۔جس ترتیب سے

اہل اللہ نے معرفت کی راہ طے کی، آپ انہیں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس ترتیب کو اپنائیں۔ یاد رکھیں کہ جو سالک اس طریقہ سے تجاوز کرتا ہے، وہ اوندھے منہ گڑھے میں گرتا ہے، استغفار وندامت کے سوا چارہ نہیں۔"

ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں: "جو سالک تصوف وسلوک کو تسبیح پھیرنے تک ہی محدود سمجھے وہ جاہل ہے۔ اس کا ذکرِ لسانی لقلقہ اور اس کا ذکرِ قلبی وسوسہ ہے۔ وہ بے شک اوپر سے لَا اِلٰہ ہے مگر اندر سے کالی بلا ہے۔ بدخُلق، بدمزاج، کینہ ور، حاسد خواہ کسی بزرگ کی سندِ خلافت رکھتا ہو اسے معرفتِ الٰہی کا ذرہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔ وہ اپنی بدخلقی اور بدمزاجی کی بدولت سب کچھ گنوا چکا ہے۔ عارف کی زبان گنگ ہوتی ہے نہ کہ شاکی۔ مزاج میں اعتدال ہوتا ہے نہ کہ ابتذال۔ ایسے صوفی کی کشف وکرامات کو کھوٹے سکوں کے بدلے بھی قبول نہیں کیا جائے گا، جنت کی نعمتیں تو بڑی دور کی بات ہے۔" (مکتوب نمبر ۵۰)

اسی طرح مکتوب نمبر (۵۹) میں لکھتے ہیں کہ "اے عزیز! ذکرِ قلبی کے بغیر اعمال کی حقیقت کا نصیب ہونا ناممکنات میں سے ہے اور وقوفِ قلبی ذکرِ قلبی کا چور دروازہ ہے۔ وقوفِ قلبی ہر حالت میں قلب کی طرف متوجہ رہنے کو کہتے ہیں۔ جو انسان اس کی مشق کرلے وہ روحانیت کے راستے میں بجلی کی طرح سفر کرتا ہے۔ لیکن تجربہ اس کا شاہد ہے کہ کئی لوگ حلال وحرام کا خیال رکھتے ہیں، طہارت اور مراقبہ کا اہتمام کرتے ہیں، جھوٹ وغیبت و لایعنی سے پرہیز کرتے ہیں مگر وقوفِ قلبی کا اہتمام نہ کرنے کی بنا پر وہ سفر برسوں میں طے کرتے ہیں جو کہ منٹوں اور سیکنڈوں میں کرنا چاہیے۔ لہٰذا آپ سے گزارش ہے کہ وقوفِ قلبی کو معمولی نہ سمجھیں۔ مقبول اوقات میں وقوفِ قلبی کے لیے دعائیں کریں بلکہ اسے ہر دعا کی روح تصور کریں۔"

مکتوباتِ فقیر کے مطالعے سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ صاحبِ مکتوبات (حضرت جی قدس سرہ) کو قرآنی وحدیثی علوم سے غیر معمولی شغف تھا، بلکہ ان میں گہرا درک بھی حاصل تھا اور آیاتِ قرآنیہ واحادیثِ مبارکہ سے برموقع استدلال کی آپ کو خوب خوب مہارت حاصل تھی۔ چناں چہ بہ وجہ طوالت یہاں نمونے نقل کرنے سے گریز کیا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں مکتوب (۳) اور مکتوب (۵) کا مطالعہ ہی کافی ہوگا کہ کس طرح آپ نے ایک ایک صفحے کے اِن دو مکتوبات میں دسیوں قرآنی دعائیں اور ہدایات، دعائیہ اسلوب میں اور خوب صورت ادبی پیرایے میں پیش فرمائی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مکتوباتِ فقیر میں (مکتوبات کی ادبی صنف کے لحاظ سے جائزہ لیا جائے تو) سادگی بھی ہے اور بے تکلفی بھی، برجستگی بھی ہے اور دلکشی بھی، حقیقت نگاری بھی ہے اور بیانِ واقعی بھی، اپنائیت کا احساس بھی ہے اور شفقت کا اظہار بھی۔ اسی طرح اس میں ایک شیخِ طریقت کی دردمندی بھی ہے اور مشفق رہبر کی خیر خواہی بھی،

خوب صورت نقش ونگار کی طرح جا بہ جا پھیلے ہوئے علوم کے موتی بھی ہیں اور عمل پر ابھارنے بلکہ عملی زندگی میں قدم رکھنے پر مجبور کرنے والے کلمات پُرتاثیر بھی، اسی لیے یہ مجموعہ پڑھتے ہوئے دل چاہے گا کہ کاش یہ کبھی ختم نہ ہو۔ مکتوباتِ فقیر کا مجموعہ اس قابل ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے اور نہ صرف دینی محفلوں میں، بلکہ اپنے گھریلو بیٹھکوں میں، اپنے دوستوں کی مجلسوں میں، اپنے اعزہ واقارب سے ہونے والی ملاقاتوں میں بلکہ اپنے ہر ملنے جلنے والے فرد کو پڑھ کر سنائی جائے کہ اس میں صاحبِ مکتوبات کا دردِ دل ہے اور ان کا وہ سوزِ دروں بھی، جس کے ساتھ ان کے شب و روز بسر ہوا کرتے تھے اور جس پر مکتوباتِ فقیر کی عبارتیں شاہد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مکتوبات میں ایک جگہ علامہ اقبالؒ کی زبان میں ان کی یہ دعائیں ملتی ہیں

یا رب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے
اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشاں کو
وہ داغِ محبت دے جو چاند کو شرما دے

☆☆☆

خُطوط ہائے راہِ مُعرفت

درسِ قصدُ السبیل

(قسط سوم)

تیسری ہدایت: شیخِ کامل کی پہچان

شیخِ کامل وہ ہے جس میں درجِ ذیل علامات پائی جاتی ہوں۔

(۱) وہ بقدرِ ضرورت دین کا علم رکھتا ہو۔ (۲) عقائد میں، اعمال میں اور اخلاق میں شریعت کا پابند ہو۔ (۳) دنیا کی حرص نہ رکھتا ہو۔ (۴) کمالات کا دعوے دار نہ ہو۔ (۵) وہ خود کسی شیخِ کامل کی صحبت و تربیت پایا ہوا ہو۔ (۶) اس کے جاننے والے منصف علماء و مشائخ اسے اچھا سمجھتے ہوں۔ (۷) عوام کے مقابلے میں خواص یعنی سنجیدہ اور دین دار لوگ اس کی طرف زیادہ مائل ہوں۔ (۸) اس کے مریدین میں اتباعِ شریعت و سنت کا اہتمام ہو اور دنیا داری کی ہوس سے دور ہوں۔ (۹) وہ اپنے مریدین کو شریعت و سنت کا پابند بناتا ہو اور خلاف ورزی کرنے والوں کی تنبیہ و تلقین بھی کرتا رہتا ہو، محض مرید بنا کر ان کے حال پر چھوڑ نہ دیتا ہو۔ (۱۰) اس کی صحبت میں کچھ وقت گزارنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور حق تعالیٰ سے محبت میں ترقی محسوس ہوتی ہو۔ (۱۱) وہ خود بھی پابندیٔ شریعت کے علاوہ ذکر و شغل اور معمولات کا پابند ہو۔

پس جس شیخ میں مذکورہ بالا صفات پائی جاتی ہوں جو تھوڑی صحبت یا چند بار کی ملاقات میں بہ آسانی سمجھ میں آسکتے ہیں تو ان صفات کے بعد اب اس میں کسی کرامت و کشف اور تصرف و توجہ وغیرہ کو تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ ان امور کا بزرگی اور ولایت سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ وہ چیزیں ہیں جو بسا اوقات مسلمان تو کیا غیر مسلم میں بھی مشق و مجاہدے سے پیدا ہو سکتی ہیں۔

تشریح وتوضیح

تصوف وسلوک کی راہ میں سالکین کو روحانی امراض و باطنی عیوب سے پاک کرنے، شیطان مردود اور نفسِ امارہ کے داؤ پیچ سے بچنے اور اپنے محبوب حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کی سچی محبت پانے پر محنت وریاضت کرائی جاتی ہے؛ لیکن ان سب امور کی تحصیل کسی شیخِ طریقت اور مرشدِ کامل کی زیرِ نگرانی وتربیت ہی ممکن ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی پودا کسی مالی کے ہاتھوں میں پروان چڑھے تو وہ سیدھا بھی ہوتا ہے، فائدہ منداور ثمر آور بھی۔ جب کہ خودرَو پودا اکثر و بیشتر ٹیڑھا بھی ہوتا ہے، اس کی شاخیں بھی بے سلیقہ ہوتی ہیں۔ اسی طرح جو انسان کسی شیخِ کامل سے تربیت پائے، اس کی شخصیت حسنِ تربیت کی وجہ سے دوسروں کے لیے بے ضرر، راحت رسا اور نافع بن جاتی ہے۔ شریعت نے تربیت پانے کو اتنی اہمیت دی کہ کلبِ مُعلَّم (تربیت یافتہ شکاری کتے) کے شکار کو بھی کچھ شرائط کے ساتھ حلال جانا گیا۔ اسی وجہ سے سالکین کرام کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ کسی شیخِ کامل کے زیرِ تربیت رہ کر راہِ سلوک طے کریں۔

چوں تو کردی ذاتِ مرشد را قبول
ہم خدا آمدز ذاتش ہم رسول
نفس نتواں کشت الا ذاتِ پیر
دامنِ آں نفس کشِ محکم بگیر

ترجمہ: "تو نے پیر کی ذات کو قبول کرلیا۔ اس سے تجھے اللہ بھی مل گیا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی۔ اس نافرمان نفس کو پیر کی ذات کے سوائے کوئی نہیں مار سکتا۔ تو اس نفس کو مارنے والے پیر کا دامن مضبوط پکڑ۔"

شیخ ومرشد کی ضرورت

راہِ تصوف وسلوک دراصل حیوانیت سے انسانیت کی طرف ایک سفر ہے، بیعت وارادت کا اصل مقصد انسان کے باطن کو اخلاقِ رذیلہ وخبیثہ سے خالی کر کے اخلاقِ حمیدہ سے متصف کرنا ہے، اس کے لیے شیخ ومربی اور مصلح ومرشد کی تلاش اور پھر اپنے آپ کو مکمل طور پر ان کے حوالہ کر دینا راہِ سلوک کا سب سے پہلا مرحلہ اور پہلا قدم ہے؛ تاکہ اصلاحِ باطن، تربیتِ اخلاق، تزکیۂ نفس وتصفیۂ قلب کے اہم ترین سفر کا آغاز ہو سکے۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے فرمایا:

"اصلاح اور تربیت کا باب بڑا ہی نازک اور باریک مسئلہ ہے؛ اس کے لیے ماہرین کی ضرورت ہے۔ بدون ماہرین کے طالب ہزاروں فضولیات کا شکار بنا رہتا ہے نہ راہ پاتا ہے اور نہ مطلوب اور مقصود تک رسائی ہوتی ہے۔ غیر مطلوب، غیر مقصود میں ساری عمریں خراب اور برباد ہو جاتی ہیں اور حقیقت کا پتہ تک نہیں چلتا۔ غرض شیخِ کامل کے سر پر ہونے کی ضرورت ہے وہ اس راہ کا واقف ہوتا ہے۔ وہ ہر شخص کی حالت کے مطابق تعلیم کرتا ہے، سب کو ایک لکڑی سے نہیں ہانکتا؛ کیوں کہ ہر ایک کی طلب جدا، مذاق جدا، قوت جدا، فہم جدا، عقل جدا، غرض ہر شخص کے ساتھ جدا معاملہ ہوتا ہے۔" (ملفوظاتِ حکیم الامت، ج:۸، ص:۱۲۵)

شیخ و مرشد کی صفات اور پہچان

اصلاح و تربیت کے لیے پیر و مرشد سے وابستگی اور مربوط ہونا انتہائی ضروری ہے؛ لیکن سوال یہ ہے کہ اپنے ظاہری و باطنی اعمال کی اصلاح اور نفسانی امراض کے علاج کے لیے کس کو اپنا شیخ بنائیں؟ وہ شخصیت کیسی ہونی چاہیے؟ کیوں کہ جب شیخ خود تربیت یافتہ اور واقعۃً مصلح و مربی ہو تب ہی اصلاح ممکن ہے؛ ورنہ رسمی بیعت اور وقت گزاری کا کوئی سود مند نتیجہ سامنے نہیں آ سکتا۔

جیسے آدمی جسمانی بیماریوں میں تا بہ امکان بہتر سے بہتر حاذق و شفیق معالج و طبیب کو تلاش کر کے اس سے رجوع کرتا ہے اسی طرح باطنی و نفسانی بیماریوں کے معالج یا شیخ میں بھی اس کا اہتمام لازم ہے۔

اسی طرح جب علمِ ظاہر کے حصول میں جب اس بات کا لحاظ ضروری ہے کہ جن سے علم حاصل کیا جا رہا ہے ان کو اچھے سے پرکھ لیا جائے؛ جیسا کہ امام مسلمؒ نے ارشاد فرمایا: فَانْظُرُوا عَمَّنْ تَأْخُذُونَ دِينَكُمْ (صحیح مسلم، مقدمہ، حدیث:۲۶) ترجمہ: پس تم دیکھ لو کہ کس شخص سے اپنا علم حاصل کر رہے ہو۔" اسی طرح اصلاحِ باطن کے باب میں شیخ و مصلح کے بارے میں بھی دیکھنا ضروری ہے کہ اس کے اندر شیخِ کامل کی صفات ہیں کہ نہیں؟

شیخ ابن عربیؒ نے اجمالاً و اختصاراً شیخِ کامل کی تین علامات بیان فرمائی ہیں: (۱) دین انبیاء کا سا ہو۔ (۲) تدبیر اطباء کی سی ہو۔ (۳) سیاست بادشاہوں کی سی ہو۔ (شریعت و تصوف، از: مولانا مسیح اللہ صاحبؒ:۳۶)

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے ایک مکتوب کے جواب میں پیر و مرشد کی صفات لکھتے ہوئے عالمِ ربانی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی کتاب بہ نام "شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل" سے اختصاراً پانچ صفات بیان فرمائی ہیں۔ وہ پانچ صفات یہ ہیں:

(۱) قرآن اور حدیث کا علم ہو (قرآن میں اتنا علم ہونا کافی ہے کہ تفسیرِ مدارک، جلالین اور اس جیسی کتب پڑھ چکا ہو اور حدیث میں مشکوٰۃ وغیرہ کتب کی تعلیم حاصل کی ہو)

(۲) کبیرہ گناہوں سے پرہیز رکھتا ہو اور صغیرہ گناہوں پر اڑ نہ جاتا ہو (یعنی اس میں عدالت اور تقویٰ پایا جاتا ہو)

(۳) دنیا کا تارک ہو اور آخرت کا راغب، طاعاتِ مؤکدہ اور اذکارِ منقولہ کا (جو کہ صحیح احادیث میں مذکور ہیں) محافظ ہو اور ہمیشہ دل کا تعلق اللہ پاک سے رکھتا ہو اور یادداشت کی مشق کامل اس کو حاصل ہو۔

(۴) امرِ مشروع کا حکم کرتا ہو اور خلافِ شرع سے روکتا ہو، اور اپنی رائے میں مستقل نہ ہو کہ مردِ ہرجائی، مردم خیالی جس کی نہ رائے ہو نہ امر، اور مروت والا اور عقلِ کامل رکھتا ہو تا کہ اس کی بتائی ہوئی اور رد کی ہوئی باتوں پر اعتماد کیا جائے۔

(۵) وہ کامل مرشدوں میں رہا ہو، اور یہ یعنی کاملین کی صحبت اس لیے مشروط ہوئی ہے کہ عادتِ الٰہی یوں جاری ہوئی ہے کہ انسان کو فلاح حاصل نہیں ہوتی اور مراد نہیں ملتی جب تک کہ مفلحین اور مراد پانے والوں کو نہ دیکھے جیسے کہ انسان کو علم نہیں حاصل ہوتا مگر علماء کی صحبت سے، یہی حالت دوسرے پیشوں کی ہے یعنی آہنگری بدونِ صحبتِ آہنگر اور نجاری بدونِ صحبتِ نجار کے نہیں آتی۔ (شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل، ص: ۲۳)

حضرت تھانویؒ نے شیخِ کامل کی گیارہ صفات اور علامات بیان فرمائی ہیں۔ جو سطورِ ذیل میں ترتیب وار بالتفصیل قلم بند کی جارہی ہیں؛ تا کہ شیخِ کامل کی شناخت اور پہچان آسان ہو سکے۔

(۱) وہ بقدرِ ضرورت دین کا علم رکھتا ہو:

سب سے پہلی بات: شیخ و مرشد بقدرِ ضرورت علمِ دین سے واقف ہو، مکمل عالم ہونا یا کسی ادارے یا مدرسہ سے فارغ التحصیل ہونا ضروری نہیں ہے؛ البتہ بقدرِ ضرورت علمِ دین سے واقفیت کی شرط بھی اس لیے کہ سالکین اور مریدین کو مشروعات کا امر کرنا اور خلافِ شرع سے روکنا، تسکینِ باطنی کی طرف رہنمائی کرنا اور بری خصلتوں سے دور کرنا نیز صفاتِ حمیدہ کا حاصل کرنا آسان ہو سکے؛ ورنہ جو شخص ان امور کا عالم اور واقف کار نہ ہو تو وہ اوروں کو اس پر کیسے عمل پیرا کر سکے گا؟ اسی لیے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا: کہ "علمِ شریعت شرط ہے طریقت اور تصوف کی"

چناں چہ تاریخ میں بہت سے ایسے مشائخ عظام گذرے ہیں جو باضابطہ مکمل عالم تو نہیں تھے؛ لیکن عارف اور عاشق ضرور تھے؛ جیسے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ،

حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب عارفیؒ وغیرہ۔

(۲) عقائد میں، اعمال میں، اور اخلاق میں شریعت کا پابند ہو

دینِ اسلام مکمل نظامِ حیات اور دستورِ زندگی ہے، اسلام کی پرشکوہ عمارت پانچ ستونوں پر قائم ہے: (۱) عقائد (۲) عبادات (۳) معاملات (۴) معاشرت (۵) اخلاقیات۔

ارشادِ باری ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً (سورۃ البقرہ، آیت: ۲۰۸)

ترجمہ: "اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ"

یہ خطاب تمام اہلِ اسلام سے ہے کہ وہ ہر معاملہ اور ہر حال میں اسلام کی تعلیمات کے سامنے تابعِ فرمان اور سرنگوں ہو جائیں۔ لیکن افسوس کہ صورتِ حال انتہائی ناگفتہ بہ ہے۔

چناں چہ حضرت تھانویؒ آداب المعاشرت کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں کہ: "اس وقت دین کے پانچ اجزاء میں سے عوام نے تو صرف دو ہی جزو کو داخلِ دین سمجھا، یعنی عقائد و عبادات کو اور علماء نے تیسرے جزو کو بھی دین میں داخل کیا یعنی صفائی معاملات کو اور مشائخ نے چوتھے جزو کو بھی دین قرار دیا یعنی اخلاق باطنی کی اصلاح کو، لیکن ایک پانچویں جزو کو کہ جو ادب معاشرت ہے قریب قریب تینوں طبقوں نے الا ماشاء اللہ اکثر نے تو دین سے بے تعلق قرار دے رکھا ہے۔"

چناں چہ شیخ ایسا ہونا چاہیے کہ وہ عقائد و اعمال، اخلاق و معاشرت؛ ہر نقل و حرکت میں رب کی فرماں برداری اور شریعت کی پاسداری ملحوظ رکھے۔ لہٰذا اس کی ایمانیات و عقائد اسلامی ہوں۔ اعمال و عبادات مطابقِ شریعت ہوں۔ اور اخلاقیات کے باب میں اخلاقِ حسنہ اور خُلقِ محمدی کا پرتو ہو تو ان شاء اللہ پھر وہ دوسروں کے لیے نمونہ بنے گا۔

(۳) دنیا کی حرص نہ رکھتا ہو

وصول الی اللہ کا راستہ طے کرنے کے لیے جو اوصاف مطلوب ہیں، انہی میں ایک وصف "زہد" بھی ہے، زہد کی حقیقت یہ کہ انسان دنیا میں تو رہے؛ مگر دنیا کی محبت دل میں نہ آئے، اس کی مثال جیسے کشتی کے چلنے کے لیے پانی کی ضرورت ہوتی ہے؛ مگر فائدہ تب ہے جب پانی کشتی کے نیچے ہو، اوپر نہ ہو۔ اگر بالفرض وہ پانی کشتی کے اندر آجائے تو کشتی کے ڈوبنے کا سبب بنے گا۔ بالکل یہی مثال دنیا کی ہے۔

غریب ہونا کوئی فضیلت اور بڑائی کی چیز نہیں ہے، ہاں! حدیث مبارکہ میں جو مذکور ہے کہ:

"يَدْخُلُ الْفُقَرَاءُ الْجَنَّةَ قَبْلَ الْأَغْنِيَاءِ بِخَمْسِ مِائَةِ عَامٍ"

(سنن ترمذی/کتاب الزہد عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم/حدیث: ۲۳۵۳)

ترجمہ: "فقراء جنت میں مالداروں سے پانچ سو برس پہلے داخل ہوں گے"

اس میں غریبی اور فقیری کی فضیلت بتانا مقصود نہیں ہے؛ بلکہ انہوں نے غربت کی وجہ سے جو تکلیفیں جھیلی ہیں اس پر اجر اور صلہ بتایا گیا ہے، یہ بھی واضح حقیقت ہے کہ نہ غریب کو مالدار پر کوئی فضیلت ہے اور نہ مالدار کو غریب پر کوئی بڑھوتری۔

جیب میں پیسوں کا نہ ہونا، کپڑوں کا پھٹا ہوا ہونا اور پراگندہ حالت میں رہنا یہ زہد نہیں ہے؛ بلکہ علاماتِ زہد ہیں۔ مقصود و مطلوب آثارِ زہد ہیں نہ کہ علاماتِ زہد۔

چناں چہ حضرات صحابہ کرامؓ کی ابتدائی زندگی ایسی تھی کہ گزر بسر کے لیے بھی کچھ نہ تھا؛ لیکن پھر ایسا وقت آیا کہ کسریٰ کے کنگن اور سونے چاندی کے ڈھیر مسجدِ نبوی کے صحن میں پڑے تھے لیکن انہوں نے ٹھوکر ماردی، یہی زہد ہے۔ باقی عمدہ سواری میں گھومنا محل میں زندگی گزارنا یہ خلافِ زہد نہیں ہے؛ ورنہ اللہ پاک حضرت موسیٰ علیہ السلام کو محل میں نہیں پالتے، دنیا کا ہونا اگر نبوت کے منافی ہوتا تو تمام حضرات انبیاء علیہم السلام غریب ہوتے؛ جب کہ حضرت سلیمان علیہ السلام دنیا کے سب سے امیر ترین آدمی اور سب سے بڑے بادشاہ گزرے ہیں۔

زہد کی حقیقت اور خلاصہ اللہ پاک نے قرآن عظیم الشان میں یوں بیان فرمایا: لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ (سورۃ الحدید، آیت: ۲۳)

ترجمہ: (اور ہم نے یہ بات اس لیے بتادی ہے) کہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے، تم اس پر رنج نہ کرو اور جو کچھ اللہ تم کو عطا فرمائیں، اس پر اِتراؤ نہیں"

مختصر یہ کہ دنیا کی حرص ہونا دنیا کی محبت کی علامت اور نشانی ہے، پس شیخ کے لیے حبِ دنیا سے خالی ہونا ضروری ہے تاکہ وہ سالکین اور مریدین کی تربیت کر سکے۔

(۴) کمالات کا دعوے دار نہ ہو

شیخ کامل ہونے کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ اپنے کمالات اور خوبیوں کا دعوے دار نہ ہو کہ میں تمہیں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کروادوں گا یا مکہ و مدینہ تک لے جاؤں گا وغیرہ۔

راہِ سلوک میں تو یہ تربیت دی جاتی ہے کہ سالک اپنی ہر خوبی اور کمال کو اپنے شیخ کی طرف منسوب کرنے لگتا ہے، اپنا ذاتی کمال نہیں مانتا؛ یہی وجہ ہے کہ اکابر علماء کرام نے اپنی دینی وعلمی خدمات اور تحریری وتحریکی کاوشوں کو اپنے مشائخ کی طرف منسوب کرتے ہوئے انہی کے نام سے موسوم کیا، مشائخ کاملین کی زندگیوں میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں؛ چناں چہ حضرت تھانویؒ نے اپنے جاری کردہ فتاویٰ کو کتابی شکل میں ترتیب دیا تو "امداد الفتاویٰ" کے نام سے شائع فرمایا۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے قرآن عظیم الشان کی تفسیری خدمت کی تو اپنے شیخ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کے نام سے "تفسیرِ مظہری" نام رکھا۔ صرف یہی نہیں؛ بلکہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو جب حج کی سعادت نصیب ہوئی اور اس سفر میں کعبۃ اللہ کے اندر داخل ہونے کا شرف بھی نصیب ہوا تو انہوں نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے اس سعادت کو اپنے شیخ کی طرف منسوب کیا اور لکھا کہ اس سے پہلے بھی اور بعد میں بھی بہت سی دفعہ حج کی توفیق ملی لیکن اس دفعہ کعبۃ اللہ کے اندر حاضری کا شرف دراصل میرے شیخ کی برکت سے ہوا ہے۔

الغرض شیخی بگھارنا اور دعوے کرنا شیخِ کامل کے مزاج میں نہیں ہوتا۔

(۵) وہ خود کسی شیخِ کامل کی صحبت وتربیت پایا ہوا ہو

شیخ دراصل مرشد اور مربی ہوتا ہے اور خود مربی کا تربیت یافتہ ہونا ضروری ہے کہ وہ بھی شیخِ کامل کا صحبت یافتہ اور تربیت یافتہ ہو۔

بعضے لوگ خود ساختہ ذکر کرکے، ذاتی مجاہدے اور ریاضتیں برداشت کرکے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تو بہت بڑے آدمی بن چکے ہیں، ہم دوسروں کی اصلاح کریں گے تو یہ خیال بالکل غلط ہے، چاہے کوئی کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، جب تک شیخ اس کی گردن پر پیر نہ رکھے وہ دوسرے کے فائدے کے قابل نہیں بنتا، یہ بنیادی بات ہے۔

صحبت ایسی نعمت ہے کہ اس کا کوئی بدل نہیں، صحبت کی برکت اور ضرورت کو سمجھنے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ حضرت وحشیؓ کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چند لمحے کی صحبت سے وہ مقام مل گیا کہ اگر پوری دنیا حضرت اویس قرنیؓ جیسے حضرات سے بھر جائے تو بھی ان کی گردِ راہ کو نہیں پاسکتی۔ اسی طرح اصحابِ کہف کے کتے نے چند دن صلحاء کی صحبت اختیار کی تو اس کے ساتھ جنت کا وعدہ ہوا۔ (تفسیر الخازن، ج: ۴، ص: ۲۰۵) صحبت کے فیضان اور اس کی غیر معمولی برکات کے لیے اس سے زیادہ واضح مثال اور کیا ہوسکتی ہے؟

چناں چہ خود شیخ کا تربیت یافتہ ہونا بھی ضروری ہے، کتنی ہی عبقری شخصیات ایسی گزری ہیں کہ (جنہیں دنیا

نے جبال العلم تسلیم کیا؛ لیکن انہوں) نے علم وحکمت کی اونچائیوں کو چھونے کے بعد بھی کسی پیر ومرشد سے اپنی تربیت کروانا ضروری سمجھا؛ چناں چہ حضرت سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے: "اگر ابو ہاشم الصوفی نہ ہوتے تو میں ریاکاری کی دقیق باتوں سے واقف نہ ہوتا۔" (نفحات الانس، کتاب اللمع: ص ۲۲)

اسی طرح حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام مالکؒ نے حضرت جعفر صادقؒ سے فیض پایا۔ امام اعظمؒ نے دوسال کے رابطہ کے بعد فرمایا:

لَوْلَا السَّنَتَانِ لَهَلَكَ النُّعْمَانُ

"وہ دوسال (حضرت جعفر صادقؒ کی صحبت وتربیت میں) نہ ہوتے تو نعمان ہلاک ہوجاتا۔"

لہٰذا یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ خود شیخ اور مربی کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ کسی شیخِ کامل کی خدمت میں رہ کر تربیت حاصل کریں۔

(۶) اس کے جاننے والے منصف علماء ومشائخ اُسے اچھا سمجھتے ہوں

إِنَّمَا يَعْرِفُ ذَا الفَضْلِ مِنَ النَّاسِ ذَوُوْهُ (لوگوں میں سے صاحبِ فضل کو صرف صاحبِ فضل ہی پہچانتے ہیں)

شیخِ کامل کی ایک اہم پہچان یہ ہے کہ اہلِ حق علماء کرام ومشائخ عظام کے نزدیک وہ معتبر بھی ہو اور معتمد بھی۔ اچھا ہونے کے لیے اختلاف نہ ہونا کوئی ضروری نہیں، ہاں! اس سے کسی معاملہ میں کوئی اختلاف ہو تو ہو؛ لیکن اس کے اچھے ہونے کو تسلیم کیا جائے، اس کی بھی مثالیں موجود ہیں؛ چناں چہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی ہستی ایسی تھی کہ اکابر علمائے دیوبند: حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ اور حضرت تھانویؒ جیسی عبقری شخصیات نے انہیں اپنا شیخ مان کر ان سے تربیت حاصل کی؛ اگر چہ فقہی اعتبار سے کچھ مسائل میں اختلاف ضرور تھا؛

چناں چہ جب حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں حضرت حاجی صاحبؒ کا رسالہ "فیصلہ ہفت مسئلہ" آیا تو فرمایا کہ "اسے حمام میں جھونک دو، کسی نے کہا کہ اپنے شیخ کا رسالہ حمام میں جھونک رہے ہیں؟ فرمایا: شیخ کے ہاتھ پر ہم نے جو بیعت کی ہے وہ تصوف میں کی ہے، فقہ میں نہیں کی ہے، فقہ میں وہ ہمارے تابع ہیں"

(مجالسِ حکیم الاسلام: ۱/ ۱۲۹)

اور دوسری جانب شیخ کی عقیدت اور عظمت ایسی کہ خود حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں: کہ "ایک مجلس میں حضرت جنید بغدادیؒ بھی ہوں، حضرت بایزید بسطامیؒ بھی ہوں، حضرت شبلیؒ بھی ہوں، اور ایک طرف ہمارے

حاجی صاحب ہوں، ہم ہمارے حاجی صاحب کے سوا کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ بس اختلاف اپنی جگہ؛ لیکن شخصیت کا اعتبار اور ان پر اعتماد سو فیصد تھا۔

اختلاف و اعتراف کی ایک اور مثال: حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت تھانویؒ کے مابین سیاسی اعتبار سے اختلاف تھا؛ لیکن اس شدتِ اختلافِ رائے کے باوجود آپس میں حد درجہ احترام تھا، چناں چہ حضرت مدنیؒ سے جو حضرات بیعت کی درخواست کرتے، حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ حضرت حکیم الامتؒ سے بیعت ہونے کا مشورہ دیتے اور فرماتے "ہماری جماعت کے بڑے حضرت تھانویؒ ہیں ان سے بیعت ہو جاؤ۔"

صرف یہی نہیں بلکہ حضرت مولانا عبد الماجد دریابادیؒ حضرت مدنیؒ سے ہی بیعت ہونا چاہتے تھے مگر حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ ان کو لے کر خود تھانہ بھون تشریف لے گئے اور بیعت کی درخواست کی۔ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے ارشاد فرمایا کہ کام تقسیم کر لیا جائے۔ اگر مجھ سے بیعت ہوں تو اصلاحی تعلق آپ سے ہو، یا بیعت آپ فرمائیں اور اصلاحی تعلق مجھ سے ہو۔ آخر حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ سے بیعت ہوئے اور اصلاحی تعلق حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ سے رہا۔ (حدودِ اختلاف، ص: ۱۳۱)

(۷) عوام کے مقابلے میں خواص یعنی سنجیدہ اور دین دار لوگ اس کی طرف زیادہ مائل ہوں

شیخِ کامل (جو کہ اصلاح و تربیت کا فریضہ انجام دینے والا ہو) اس کے لیے شرط یہ ہے کہ عوام کی بہ نسبت خواص یعنی علم دوست، سنجیدہ مزاج اور دین دار طبقہ اس کی طرف زیادہ رجوع ہو؛ خواہ بیعت ہو کہ نہ ہو۔

البتہ عوام کے مقابلہ میں حفاظ، علماء کی کثیر تعداد کا متوجہ ہونا مراد نہیں ہے اور ایسا ممکن بھی نہیں ہے، کیوں کہ طبقۂ خواص باعتبارِ عوام بہت ہی کم ہیں، مراد یہ ہے کہ اہلِ علم کا بڑا طبقہ مائل ہو۔

بے دین اور غیر متشرع لوگوں کے رجوع ہونے کا اعتبار نہیں ہے؛ کیوں کہ وہ تو مداری کا تماشا دیکھنے کے لیے بھی کھڑے ہو جاتے ہیں؛ اس لیے شیخِ کامل کی علامت بتائی گئی کہ طبقۂ خواص اس کی طرف زیادہ مائل ہو۔

(۸) اس کے مریدین میں اتباعِ شریعت و سنت کا اہتمام ہو اور دنیاداری کی ہوس سے دور ہوں

تصوف و طریقت کی بنا آدابِ شریعت کی حفاظت پر ہے اور شیخِ کامل متبعِ سنت اور جامع الشریعۃ و الطریقۃ ہو تو سالکین و مریدین کے لیے پابندِ سنت و شریعت زندگی گزارنا آسان ہوگا۔

شیخ کامل کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ خود بھی نیکی کی راہ پر چلتا ہے اور سالکین کو بھی اسی پر چلاتا ہے، پس سالکین و مریدین کا پابندِ صوم و صلوٰۃ ہونا، معاملات کی صفائی اور حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کرنا، فرائض کی انجام

دہی اور سنت کی پیروی کرنا دراصل شیخ کے کامل ہونے کی علامت ہوتی ہے؛ ورنہ تو جاہل لوگوں کے یہاں بیعت وطریقت کے نام پر سنت وشریعت کا جنازہ نکالا جاتا ہے، ذکر کے چلّے کاٹنے کا بہانہ بنا کر فرض نمازوں کو پامال کیا جاتا ہے، عبادات کا مذاق اڑایا جاتا ہے، حقوق تلف کیے جاتے ہیں، حبِ جاہ اور دنیا کی حرص کی وجہ سے لڑائی جھگڑا اور قتل وغارت گری تک نوبت پہنچ جاتی ہے، پھر نتیجۃً بدعات ورسومات ہی کو اصل دین اور تعلیماتِ شریعت مان کر عمل کیا جاتا ہے؛ حالاں کہ سچی بات تو یہ ہے کہ وصول الی اللہ تب ہی ممکن ہے جب طریقۂ سنت پر عمل پیرا ہو۔ اور اللہ کے یہاں تعلیماتِ اسلام اور آدابِ شریعت کی مکمل پاسداری کا ہی اعتبار ہے، پس سالکین کی زندگی سنت وشریعت کے زیور سے آراستہ ہونی چاہیے۔

(۹) وہ اپنے مریدین کو شریعت وسنت کا پابند بناتا ہو اور خلاف ورزی کرنے والوں کی تنبیہ و تلقین بھی کرتا رہتا ہو، محض مرید بنا کر ان کے حال پر چھوڑ نہ دیتا ہو

جیسے ایک شخص ہوائی جہاز پر سفر کرنا چاہے تو وہ اچھی کمپنی کا ٹکٹ خرید کر اور پائلٹ پر اعتماد کر کے جہاز میں بیٹھ جاتا ہے تو پائلٹ سواری کو منزل پر پہنچا دیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح سالک شیخِ کامل پر اعتماد کرتے ہوئے باطنی سفر کے لیے اپنے آپ کو شیخ کے حوالے کرتا ہے تو شیخ اپنے مرید کو راہِ سلوک پر چلاتا ہوا اللہ تعالیٰ سے واصل کر دیتا ہے۔ اور شیخِ کامل کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ اپنے مرید کو محض اپنی خدمت اور آگے پیچھے گھومنے کے لیے نہیں رکھتا؛ بلکہ خود بھی اتباعِ سنت وشریعت کی زندگی گزارتا ہے اور اپنے مریدین وسالکین کو بھی اس کا پابند بناتا ہے اور اس پر ملنے والے انعام اور صلہ کی تعلیم دیتا ہے، خلافِ ورزی اور حکم عدولی کی وعیدوں (نقصانات اور عذابات) سے واقف کروا کے بچنے کی تلقین کرتا ہے اور نگرانی کرتا رہتا ہے۔ مختصر یہ کہ شیخ کامل خود بھی اللہ تک پہنچتا ہے اور سالکین ومریدین کو بھی پہنچاتا ہے۔

(۱۰) اس کی صحبت میں کچھ وقت گزارنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور حق تعالیٰ سے محبت میں ترقی محسوس ہوتی ہو

شیخِ کامل کی صفات اور علامات میں بعض اہلِ علم واصحابِ فن نے یہ بات بھی ذکر فرمائی ہے کہ

اَلتَّجَافِیْ عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ وَالْاِنَابَۃُ اِلٰی دَارِ الْخُلُوْدِ وَالْاِسْتِعْدَادُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ نُزُوْلِہٖ

ترجمہ: ”دھوکہ کے گھر سے دوری اختیار کرنا اور ہمیشہ کے گھر کی طرف متوجہ ہونا اور موت کے آنے سے پہلے اس کی تیاری کرنا۔“

سچی بات یہ ہے کہ کمینی دنیا کا طلب گار، شیخِ طریقت بننے کا اہل نہیں ہوتا۔

اور شیخِ کامل کی صحبت اور مجلس اس بات کی عکاس ہو جو حدیث مبارکہ میں فرمائی گئی کہ "جسے دیکھ کر تمہیں اللہ کی یاد آئے اور جس کی گفتگو تمہارے علم میں اضافہ کا سبب بنے اور جس کے اعمال تمہیں آخرت کی یاد دلائیں" مَنْ ذَكَّرَكُمُ اللّٰهَ رُؤْيَتُهُ، وَزَادَ فِي عِلْمِكُمْ مَنْطِقُهُ، وَذَكَّرَكُمْ بِالْآخِرَةِ عَمَلُهُ (الاولیاء لابن اَبی الدنیا، صفحہ ۱۷، حدیث: ۲۵)

پس شیخِ کامل کے یہاں دنیا سے دور اور آخرت سے قریب ہو کر زندگی گزارنے کا سبق ملے، حبِ جاہ کے بجائے حبِ الٰہی اور عشقِ مجازی کے بجائے عشقِ حقیقی کی تعلیم ملے۔ اور یہ استحضار ہو کہ "اللہ بس باقی ہوس" الغرض شیخِ کامل کے فیضانِ صحبت سے یہ پیغام ملے ؎

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ
مجھے کام بس اپنے کام سے
ترے ذکر سے تری فکر سے
تری یاد سے ترے نام سے

(۱۱) وہ خود بھی پابندیِ شریعت کے علاوہ ذکر و شغل اور معمولات کا پابند ہو

یہ اصولی بات ہے کہ جس قدر اونچا مقام اور بڑا عہدہ ہوتا ہے اسی اعتبار سے ذمہ داری بھی بڑھ جاتی ہے، شیخ بننے کے بعد معمولات کی چھٹی نہیں ہو جاتی؛ بلکہ شیخ بننے کے بعد معمولات بڑھ جاتے ہیں؛ مثلاً آدھا گھنٹہ مراقبہ سے کام نہیں چلے گا، اب تو ایک گھنٹہ کرنا پڑے گا، فرائض اور امورِ واجبہ کی ادائیگی سے آگے بڑھ کر سنن و آداب، مستحبات و نوافل بھی معمولات کا حصہ بننا چاہیے۔

چناں چہ حضرت بایزید بسطامیؒ کو ایک بار کرامت بزرگ کے بارے میں پتہ چلا تو آپ ملنے کے لیے تشریف لے گئے، ابھی دور ہی تھے کہ دیکھا اس بزرگ کو تھوکنے کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے قبلہ کی طرف تھوکا۔ حضرت بایزید بسطامیؒ اسی وقت بغیر سلام کیے واپس تشریف لائے اور کہا کہ "جو شخص ایک مستحب کی پابندی نہیں کر سکتا وہ اتنا بڑا ولی کیسے بن سکتا ہے۔" چناں چہ ولی اور مرشد کی پہچان یہی ہے کہ ہر حال میں اس کا ہر کام شریعت و سنت کے مطابق ہو۔ (تصوف و سلوک، ص: ۱۶۰)

ایک شخص حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہا۔ چار پانچ مہینے کے بعد جب جانے لگا تو کہا کہ

حضرت! میں تو اس لیے آیا تھا کہ آپ کی کوئی کرامت دیکھوں، مگر مجھے کوئی کرامت نظر نہیں آئی۔

حضرت نے فرمایا اچھا! یہ بتاؤ کہ اس دوران تم نے میرا کوئی کام خلافِ سنت دیکھا؟ اس نے کہا نہیں۔

حضرت نے فرمایا اور کیا کرامت چاہتے ہو؟ یعنی سب سے بڑی کرامت ہی یہ ہے کہ آدمی استقامت کے ساتھ سنتوں پر عامل رہے۔ (محمود المواعظ: ۲/ ۲۶۰)

خلاصۂ کلام:

یہ مذکورہ بالا گیارہ علامات وہ ہیں جن کے ذریعہ کسی کے شیخ کامل اور مصلح و مربی ہونے کا پتہ لگایا جاسکتا ہے، اس کا اندازہ لگانے کے لیے بار بار کی ملاقاتیں یا چند بار کی صحبتیں کافی ہیں۔

لیکن بہت سارے لوگ مختلف انداز سے شیخ کو جانچتے اور پرکھتے ہیں؛

مثلاً کشف و کرامات یا کسی محیر العقول امر کے منتظر رہنا یا اس بات کی شرط لگانا کہ شیخ کی کبھی تہجد قضا نہ ہوئی ہو، اشراق و چاشت کی پابندی کرتے ہوں یا یہ دیکھنا کہ شیخ توجہ کیسے دیتے ہیں اور کتنا اثر ہوتا ہے؟

ایسے ہی شیخ کی قابلیت جانچنے کے لیے اس کی بیوی بچوں کی دین داری اور ان کی زندگی کو دیکھنا وغیرہ۔

مذکورہ بالا امور شیخ کی قابلیت کے لیے کوئی معنیٰ نہیں رکھتے؛ کیوں کہ کشف و کرامات کا بزرگی اور ولایت سے کوئی تعلق نہیں ہے، تہجد، اشراق اور چاشت وغیرہ کی پابندی ذاتی عمل ہے، توجہ کا تعلق محنت سے ہے، ایسے ہی بیوی بچوں کے تئیں اصلاحی محنت اور دینی فہمائش کا تو شیخ مکلّف ہے، ہاں! فہمائش میں کوتاہی پر مسئول ہوگا؛ لیکن دین دار بنانے کا ذمہ دار نہیں ہے؛ ورنہ لوگ حضرت نوح علیہ السلام سے ان کے بیٹے کے تعلق سے سوال کرتے۔ حضرت لوط علیہ السلام سے ان کی بیوی کے بارے میں پوچھتے۔

الغرض یہ سب چیزیں نہیں دیکھنی چاہیے، بس شیخ سے نفع ہو رہا ہے تو کافی ہے، دیگر امور کی جانچ پڑتال نہ معتبر ہے، نہ مطلوب ہے۔

☆☆☆

سازِ محبّت

مناجاتِ منصور رحمۃ اللہ علیہ

(شاعرِ محبت حضرت سید منصور غوری صاحبؒ کے مجموعۂ کلام میں مناجات پر مشتمل اشعار کا معروضی مطالعہ!)

از: مفتی محمد عمران قاسمی کورٹلوی

مناجات عربی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں سرگوشی کرنا اور چپکے سے کوئی بات کہنا، ایسے کہ کسی اور کو خبر نہ ہو۔ اس لفظ کا اطلاق تو عام ہے اور یہ ہر سرگوشی کے لیے بولا جاسکتا ہے؛ لیکن شرعی اصطلاح میں مناجات کہتے ہیں اپنے مالک کے دربار میں پیش کی جانے والی خاموش فریادوں کو، بے زبان دعاؤں کو، بے آواز التجاؤں کو اور دلی آرزوؤں کو! عبد و معبود کے درمیان مناجات کا یہ رشتہ ایسے طور پر ہوتا ہے کہ کسی اور کو اِس تعلق کے بارے میں خیال و گمان بھی نہیں ہوتا۔

مناجات رات کی تاریکیوں میں بھی ہوتی ہے اور دن کے اجالوں میں بھی، تنہائی کے عالم میں بھی ہوتی ہے اور لوگوں کے درمیان بھی، یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو بندے پر کسی بھی وقت طاری ہوسکتی ہے۔ عام طور پر جب پوری دنیا محوِ آرام ہوجاتی ہے اور ہر چہار سو خاموشی ڈیرے ڈال دیتی ہے تو غلام بندہ بے چینی و بے قراری کے عالم میں اٹھ بیٹھتا ہے، اپنے آقا کے دربار میں حاضر ہوتا ہے، کھڑے ہوکر ان کا پاک کلام پڑھتا ہے، پھر دورانِ تلاوت رک رک جاتا ہے۔ کبھی ان کی عظمت کا خیال آتا ہے تو جسم پر ہیبت طاری ہوجاتی ہے اور کبھی ان کی رأفت و محبت کے نمونے یاد آتے ہیں تو دل مچل جاتا ہے اور طبیعت وجد میں آجاتی ہے۔ دوگانہ کی ادائیگی کے بعد یہ بندۂ عاجز و کمتر، ایک غلام کی طرح ان کے عالی دربار کا سوالی بنتا ہے۔ اپنی زبان سے ان کی پاکی بیان کرتا ہے، دیر تک ان کی حمد و ثنا کے کلمات کہتا رہتا ہے۔ پھر اپنا حالِ دل اور سوزِ دروں ان کی جناب میں رکھتا ہے۔ محویت اور انہماک کے عالم میں کبھی بے خود ہوجاتا ہے اور بے قراری کے عالم میں کبھی اس کی زبان بھی خاموش

ہوجاتی ہے پھر بے زبان دل گویا ہونے لگتا ہے، تنہائی و خاموشی کے اِس عالم میں رب کی بارگاہ میں بندۂ عاجز و غلام روتا ہے لیکن آواز نہیں نکلتی بلکہ آنسو بہتے ہیں، عرض و گذارش کرتا ہے لیکن الفاظ کے بجائے سسکیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ اس وقت چیخ و پکار نہیں ہوتی بلکہ خاموش فریاد و فغاں اور آہ و زاری ہوتی ہے۔ اہلِ دل حضرات راز و نیاز کے ایسے انداز کو مناجات سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ مناجات کا یہ انداز دعا سے بھی بلند تر ہے اور افضل و برتر!

راتوں کو اٹھ کر اس طرح سے عبادت کرنے اور اپنے رب کے سامنے تڑپ تڑپ کر، گڑگڑاتے ہوئے کبھی خوف اور کبھی امید کے ساتھ دعائیں مانگنے اور مناجات میں مشغول رہنے والے لوگوں کے بارے میں ہی یہ ارشادِ ربانی ہے: تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا (سورہ الم سجدہ، آیت: ۱۶)

ترجمہ: "ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں، وہ اپنے رب کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے ہیں۔"

چناں چہ رات کے آخری پہر کی یہ مناجاتیں؛ خاتم النبیین، محبوب رب العالمین حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معمولات یومیہ میں شامل تھیں اور آپ کی اتباع کے جذبے میں آپ کے تمام صحابہؓ اور تابعینؒ و اولیاء کرامؒ کی مبارک عادت! بلکہ اللہ کے نیک بندوں اور دوستوں کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ رات کے آخری پہر کی مناجاتوں کے لیے دن بھر انتظار کرتے رہتے ہیں ؎

کب رات ہو، کب ان سے ہوں خلوت میں پھر بہم
رہتی ہے دھن یہی، ہمیں دن بھر لگی ہوئی
(مجذوبؒ)

مناجات کا ایک مخصوص وقت تو رات کی تاریکی ہے اور اس میں بھی بطور خاص، اہمیت کا حامل آخری پہر ہے، لیکن دوستانِ خدا کو رات تک چین کیسے آئے گا۔ چناں چہ وہ دن میں بھی، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، یہاں تک کہ کام کاج کے دوران بھی دل دل میں اپنے رب سے لَو لگائے رہتے ہیں اور راز و نیاز میں مصروف رہتے ہیں۔ اور اس سے تخلُّف کیسے ہوسکتا ہے، جب کہ خود باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (سورۃ الاعراف، آیت: ۵۵)

ترجمہ: "تم اپنے رب کو یاد کرو عاجزی سے اور چپکے چپکے!"

چناں چہ خاصانِ خدا اور سچے بندگانِ الٰہی اپنے رب کی یاد میں اور ان سے راز و نیاز کرنے میں محو و مست رہتے ہیں۔ حضرتِ مجذوبؒ نے ان کے حال اور کیفیت کی کیسی بہترین عکاسی کی۔ فرماتے ہیں:

تم سا کوئی ہمدم، کوئی دم ساز نہیں ہے
ہر وقت ہیں باتیں مگر آواز نہیں ہے
ہم تم ہی بس آگاہ ہیں اِس ربطِ خفی سے
معلوم کسی اور کو یہ راز نہیں ہے

کہنا چاہیے کہ مناجات میں کسی موضوع کی تخصیص نہیں ہوتی اور ہوگی بھی کیسے؟ یہ بندہ اور خدا کے درمیان رازدارانہ گفتگو کا ایک خاص انداز جو ہے مناجات میں بندہ کبھی اپنی غلامی کے انداز پیش کرتا ہے، اپنی بے مائگی کا اظہار کرتا ہے، کمزوری، عجز اور بے بسی ظاہر کرتا ہے، اپنے آقا کے سامنے اپنی حاجتیں اور ضرورتیں رکھتا ہے اور ان کی تکمیل کی گذارش کرتا ہے اور کبھی اپنی خطاؤں کی بخشش اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتا ہے، اپنے ماضی پر ندامت کے آنسو بہاتا ہے، شرمندگی کا اظہار کرتا ہے، اپنی ہر نافرمانی سے سچی توبہ کرتا ہے اور آئندہ اطاعت و فرماں برداری کی زندگی گذارنے کا پکا عزم کرتا ہے۔ اسی طرح مناجات میں بندہ پر کبھی ایک عاشقِ صادق کی کیفیات بھی طاری ہوجاتی ہیں، چناں چہ کبھی وہ اپنے محبوب سے والہانہ عقیدت و محبت کا اظہار کرتا ہے، کبھی غمِ فراق میں سرد آہیں بھرتا ہے، کبھی وصل کی تمنا کرتا ہے، کبھی خاموش راز و نیاز کرتا ہے تو کبھی دل کی باتیں بے حجابانہ سناتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مناجات یعنی راز و نیاز کے اِن سارے ہی طور طریقوں میں بندگی کا خوبصورت اقرار ہے اور بندے کی طرف سے اظہارِ محبت کا دلکش اعلان! یہی وجہ ہے کہ دوستانِ خدا اور دیوان گانِ عشق کو مناجات میں کیفیتِ سرور نصیب ہوتی ہے، تسکینِ دل کی نعمت حاصل ہوتی ہے، تسلیٔ قلب کا سامان ملتا ہے، کیف و مستی اور خوشی و سرشاری کی انمول لذت نصیب ہوتی ہے؛ بل کہ مناجات کی وجہ سے قربِ الٰہی کے درجات عطا ہوتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ قربِ الٰہی کا تازہ احساس بھی حاصل ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں متعدد حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی جو دعائیں منقول ہیں، ان میں بھی مناجاتوں کا یہ پہلو بہت دلنشیں انداز میں نظر آتا ہے:

"حضرت زکریا علیہ السلام کا حال دیکھیے کہ کِبَرِ سنی ہے، لیکن دل میں اولاد کی بلکہ اپنے وارث کی خواہش ہے۔ رہ رہ کے یہ تمنا زبان پر آتی ہے۔

چناں چہ انہوں نے چپکے چپکے دعا مانگی کہ "ربّا! میری ہڈیاں کمزوری ہوچکیں اور بال بھی سفید ہوگئے لیکن میں اب تک آپ کی رحمت سے ناامید نہیں رہا، مجھے میرے بعد اپنے رشتہ داروں کا اندیشہ ہے، دوسری طرف میری بیوی بانجھ ہے لیکن آپ مجھے ایسا بیٹا عطا فرمائیے جو میرا اور آلِ یعقوبؑ کا وارث بنے اور اس کو آپ اپنا

پسندیدہ بندہ بھی بنایئے۔" چناں چہ ان کی دعا قبول ہوئی اور ایک بیٹا دیا گیا، جس کا نام یحییٰ تھا۔ (علیہ السلام)" (سورۂ مریم، آیت: ۲ تا ۷)

اس کے علاوہ حضرت آدم وحوا علیہما السلام اور حضرت یونس علیہ السلام کی دعاؤں میں بھی مناجات کا پہلو بڑے واضح انداز میں نظر آتا ہے۔ دیکھئے (سورۃ الاعراف: ۲۳) و (سورۃ الانبیاء، آیت: ۸۷)

ہمارے نبی خاتم الانبیاء، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعاؤں میں بھی ہمیں مناجاتوں کے مذکورہ بالا پہلو (محبتِ الٰہی کی طلب، اپنی خطاؤں پر معافی ومغفرت، اپنی عاجزی و بے بسی، نیازمندی وکمتری اور کمزوری و محتاجی کا اظہار، دینی ودنیاوی حاجتوں کی تکمیل کی درخواست وغیرہ) بڑے دلکش وجامع اور نہایت خوبصورت و مؤثر انداز میں نظر آتے ہیں۔

ذرا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی درج ذیل دعا پڑھیے:

اللَّهُمَّ إِنَّكَ تَسْمَعُ كَلَامِي، وَتَرَى مَكَانِي، وَتَعْلَمُ سِرِّي وَعَلَانِيَتِي، وَلَا يَخْفَى عَلَيْكَ شَيْءٌ مِنْ أَمْرِي، أَنَا الْبَائِسُ الْفَقِيرُ، الْمُسْتَغِيثُ الْمُسْتَجِيرُ، الْوَجِلُ الْمُشْفِقُ، الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِهِ، أَسْأَلُكَ سُؤَالَ الْمِسْكِينِ، وَأَبْتَهِلُ إِلَيْكَ ابْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِيلِ، وَأَدْعُوكَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِيرِ، مَنْ خَضَعَتْ لَكَ رَقَبَتُهُ، وَفَاضَتْ لَكَ عَيْنَاهُ، وَذَلَّ جِسْمُهُ، وَرَغِمَ أَنْفُهُ لَكَ (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث: ۱۰۵۰۴)

ترجمہ: "اللہ! آپ میرا کلام سن رہے ہیں اور میرا مقام دیکھ رہے ہیں، میرے پوشیدہ اور ظاہر سب احوال آپ کے سامنے ہیں، آپ سے تو کوئی بھی بات مخفی نہیں، میں محتاج وناتواں، مدد کا طلبگار اور پناہ جو ہوں، ایک ڈرا سہما بندہ، اپنے گناہوں کا اقرار کرنے والا مجرم، میں آپ کے در کا سوالی ہوں مسکین کی طرح، اور آپ کے دربار کا گداگر، گناہ گار ذلیل کی طرح، میں آپ کو پکارتا ہوں اس ڈرنے والے اندھے کی طرح، جس کی گردن آپ کے سامنے جھکی ہے، آنکھیں اشکبار ہیں، جسم عاجز اور ناک خاک آلود!"

ذرا غور کیجیے، اس دعا کا لفظ لفظ بتا رہا ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی مناجات ہے، یہ دعا بتاتی ہے کہ اپنے رب کے دربار میں عجز کا اقرار کیسے کیا جائے، اعترافِ گناہ کا انداز کیسا ہونا چاہیے، بندگی کا اظہار کس طرح سے ہو اور ندامت وشرمندگی کے ساتھ عرض ومعروض کیسے کی جاتی ہے۔

مناجات کا یہ نبوی ذوق؛ صحابہ کرامؓ اور تابعین وتبعِ تابعینِ عظامؒ سے ہوتے ہوئے اولیائے کرامؒ میں بھی وراثتاً منتقل ہوا ہے۔ چناں چہ حضرات اولیائے کرام کو اپنے مشائخ کی بافیض صحبتوں کی برکت اور توجہ کے

فیضان سے دعا مانگنے اور مناجات میں آنسو بہانے کی نسبتِ خاصہ عطا ہوتی ہے۔ وہ دن کے مختلف اوقات میں رب سے چپکے چپکے باتیں کرنے کے علاوہ رات کی تاریکی میں اور گوشۂ تنہائی میں اپنے رب کے سامنے مناجات میں مشغول ہوتے ہیں، دربارِ الٰہی میں تڑپتے ہیں، پھڑکتے ہیں، غمِ محبت میں گھلتے اور پگھلتے ہیں، کبھی اس کی عظمتوں کے خیال سے لرزتے اور کانپتے ہیں تو کبھی اس کی رحمتوں کے تصور سے شاداں وفرحاں ہوتے ہیں، کبھی اپنی خطاؤں پر نادم اور اشکبار ہوتے ہیں تو کبھی اس کی یاد میں اشکِ محبت بہاتے ہیں۔ اور یہ بھی انہیں احساس رہتا ہے کہ دربارِ الٰہی میں یہ تڑپنا، بلکنا، رونا اور آنسو بہانا بڑی انمول نعمتِ الٰہی ہے اور خاصانِ خدا کی خاص عادت، اس لیے اس کی حفاظت وبقا کی بھی تمنا کرتے ہیں۔ چناں چہ اُن عاشقانِ الٰہی اور خاصانِ بارگاہِ ربانی کی حالت یہ ہوتی ہے کہ انہیں بارگاہِ رب العزت میں مناجات (چپکے چپکے سرگوشی) کیے بغیر چین نہیں آتا۔ ان کی مناجاتیں عموماً نثر میں ہوتی ہیں لیکن اُن اہلِ دل بزرگانِ دین میں ایک بڑی تعداد ایسی بھی ہے، جنہوں نے اپنی مناجاتوں کو شعری قالب پہنایا۔ ہمارے ممدوح شاعر، جناب حضرت سید منصور غوری صاحبؒ کے مجموعۂ کلام میں بھی مناجات پر مشتمل اشعار کا ذخیرہ، کہیں مناجات کے نام سے اور اکثر جگہ دیگر عناوین کے تحت بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح نظر آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرتِ منصورؒ کے دیگر اشعارِ محبت کی طرح، ان کے مناجاتی اشعار بھی بڑے دل سوز، روح پرور اور اثر انگیز ہیں۔ اس میں زبان و بیان کی لطافت وشیرینی بھی ہے اور استعارات وتشبیہات کی خوبی و چاشنی بھی، اس کے علاوہ روانی اور برجستگی کا خوبصورت عنصر بھی، پھر یہ کہ دل کا درد، محبت کا سوز، عشقِ الٰہی کی آتشِ حرارت اور محبتِ خداوندی کی نمی اس پر مستزاد ہے۔

حضرت منصورؒ کی دو مناجاتیں

مناجات میں حمدِ باری تعالیٰ کا پہلو بہت نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔ بندہ اپنے رب کے دربار میں تعریف وتوصیف کے کلمات پیش کرتا ہے؛ ان کی بڑائی و کبریائی، ان کی عظمت وتقدس اور پاکی، ان کی بے نظیر صناعی و کاریگری، عقل وادراک سے ماوراء ان کی غیر معمولی اور بے مثال قدرت وشہنشاہی، ہر چیز پر کامل دسترس، ہر چیز کی نگہبانی، ان کا بے اندازہ علم، ان کی حیرت انگیز وتعجب خیز تخلیقات وغیرہ بیان کرتا ہے اور اپنی کمی وکوتاہی کو پیش کر کے نظرِ رحمت کا طلب گار ہوتا ہے۔

حضرت منصور غوری صاحبؒ کے کلام میں حمدِ باری تعالیٰ پر مشتمل مناجات کا نمونہ دیکھیے:

تیری ذات لائقِ عزّ و شاں، تیری شان جَلَّ جَلَالُہٗ
کوئی شک ہے اس میں نہ کچھ گماں، تیری شان جَلَّ جَلَالُہٗ

زیبا تجھی کو ہے بزرگی، لائق ہے تری ہی برتری
تو ہی دو جہاں کا ہے حکمراں، تیری شان جَلَّ جَلَالُہٗ

ہے تری ہی صفت بے مثال، ہے ترا کمال ہی ذُوالجلال
کھڑے بے ستوں بھی جو آسماں، تیری شان جَلَّ جَلَالُہٗ

ہے ہر ایک ذرہ جہان کا، ترے فیض ہی سے تو جلوہ گر
ہے تو ہی تو خالقِ دوجہاں، تری شان جَلَّ جَلَالُہٗ

تو مُنزّہ صورت وجسم سے، تو بری ہے نقص و حُدوث سے
ہیں کہاں کس میں یہ خوبیاں، تیری شان جَلَّ جَلَالُہٗ

تو علیم ہے تو خبیر ہے، تو قدیم ہے تو قدیر ہے،
تو بلند و برتر و غیب داں، تیری شان جَلَّ جَلَالُہٗ

تو معین نحیف و ضعیف کا، ہے تو ہی سہارا یتیم کا
تو رفیقِ بے بس و بے کساں، تیری شان جَلَّ جَلَالُہٗ

یا رب یہی ہے اک التجا کہ کروں میں ذکر ترا سدا
ترا نام لب پہ ہوجائے جاں، تیری شان جَلَّ جَلَالُہٗ

منصور پہ بھی ہو اک نظر، رحمت سے اس کو نہ دور کر
ہے ترا وہ بندۂ ناتواں، تیری شان جَلَّ جَلَالُہٗ

معرفتِ الٰہی کی راہ میں آگے بڑھتے ہوئے بندہ کی اندرونی کیفیت یک بہ یک تبدیل ہونے لگتی ہے، وہ دنیا میں جہاں کہیں نظر دوڑاتا ہے، اس کو بس اپنے محبوب کے جلوے نظر آنے لگتے ہیں، یہ کائنات، اس کی چمک دمک، رنگارنگی، نوع بہ نوع تخلیقات اور حسین وجمیل مناظرِ فطرت گویا ہر چیز میں اپنے محبوب کی صناعی نظر آنے لگتی ہے؛ حتیٰ کہ آفاق سے نگاہ ہٹتی ہے تو اپنے اندرون میں بھی اس کو ہر چیز اپنے رب کی ہی لگتی ہے۔ اس میں شک

نہیں ہے کہ یہ کائنات اور اس کی تمام مخلوقات کے خالق و مالک محض اللہ ربّ العزّت ہیں، لیکن دنیا کی ہر ہر چیز کو، حتی کہ اپنی ذات کے ایک ایک جزو کو اور اپنی صفات کو بھی باری تعالیٰ کی طرف بے اختیارانہ طور پر منسوب کرنے کی دلی کیفیت کا پیدا ہوجانا؛ معرفتِ الٰہی کا ایک مقام ہے، جو عموماً راہِ محبت کے سچے راہیوں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ کہنا چاہیے کہ معرفت کے اس مقام پر بندہ اپنے کمالات کی، اپنی خوبیوں کی یہاں تک کہ آگے بڑھ کر اپنی جسمانی صفات بلکہ اپنی ذات تک کی نفی کرتا ہے اور ہر ہر چیز کو باری تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے لگتا ہے۔ شاید یہی وہ مقام ہے جس کو بعضے صوفیاء کرام نے اس طرح تعبیر فرمایا کہ "معرفتِ الٰہی کی راہ میں ایک موقع ایسا بھی آتا ہے کہ بندہ اپنے "مَن" سے نکل کر محبوب کے "تُو" میں داخل ہوجاتا ہے۔" چناں چہ بندے کی یہ دلی کیفیت کبھی الفاظ و تعبیرات کی شکل میں بھی ظاہر ہونے لگتی ہے اور بندہ اپنی مناجاتوں میں بھی اس کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ حضرت سیّد منصور غوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک اور مناجات کے درجِ ذیل اشعار اسی کے آئینہ دار ہیں۔ چناں چہ اپنی ذات وصفات کی اپنے لیے نفی کرتے ہوئے اور باری تعالیٰ کے لیے اس کو ثابت کرتے ہوئے گویا ہیں:

یہ جسم ناتواں بھی ان کا، دل بھی ان کا روح بھی اُن کی
مرا کچھ بھی نہیں ہے، جان ان کی، زندگی اُن کی

وہ دانا اور میں ناداں، وہ عالم اور میں جاہل
وہ زندہ اور میں مردہ، حیاتِ سرمدی اُن کی

میسر جو بھی مجھ کو نعمتیں ہیں، سب انہیں کی ہیں
سماعت بھی مری اُن کی، بصارت بھی مری اُن کی

انہیں کا فضل ہے یہ جو، انہیں میں یاد کرتا ہوں
مرے دل کے گلستاں میں ہے پنہاں تازگی اُن کی

عطا ان ہی کی جانب سے ہوئی ہے مجھ کو گویائی
میں بے آواز ہوں، بجتی ہے مجھ میں بانسری اُن کی

وہ باقی اور میں فانی، وہ مطلق نور، میں ظلمت
مرے تاریک دل میں جلوہ گر ہے روشنی اُن کی

سراپا شر کا میں پتلا، وہ خیر و جُود کے مالک
میں گندہ ہوں مگر ہے روح میں پاکیزگی اُن کی

وہ ہیں حاجت روا میرے تو میں محتاج سر تا پا
وہ آقا اور میں بندہ ہوں، بندہ پروری اُن کی

وہ کامل ہیں صفات و ذات میں، میں ناقص و عاجز
سرا پا عیب میں اور ذات عیبوں سے بَری اُن کی

عدم میری حقیقت، بے بسی میری علامت ہے
مجھے درکار ہے ہر ہر قدم پر رہبری اُن کی

پھر باری تعالیٰ کی نگاہوں سے اوجھل ہستی، انکی بے مثال شاہنشاہی اور قدرت کا تعارف کرواتے ہوئے کہتے ہیں:

تھی ان کی ذات غیبُ الغیب، وہ اک گنجِ مخفی تھے
نمایاں ہوگئی مخلوق سے، ذاتِ خفی اُن کی

انہیں کے جلوہ ہائے حسن کے یہ سب نظارے ہیں
چمک تاروں میں ان کی، چاند میں تابندگی اُن کی

وہ چاہیں تو فنا ہوجائے دنیا آنِ واحد میں
زمیں پر بادشاہت ہے، فلک پر سروَری اُن کی

انہی کا حکم چلتا ہے بلا شک دونوں عالم میں
عیاں ہے روزِ روشن کی طرح شاہنشَہی اُن کی

فرشتے محوِ حیرت ہیں کہ کیا ہے انتظام اُن کا
ہے ششدر عقلِ انساں دیکھ کر، کاریگری اُن کی

معرفت کی راہ طے کرتے ہوئے سالکِ طریقت کو نصیب ہونے والی بڑی نعمتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کو معیتِ الٰہی اور قربِ خداوندی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ چناں چہ وہ چپکے چپکے اپنے رب کے سامنے اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔ حضرت منصورؒ کے درج ذیل اشعار میں یہی کیفیت دیکھیے کیسی خوبی کے ساتھ نظر آتی ہے۔ فرماتے ہیں:

نظر آتے نہیں نزدیک رہ کر بھی رگِ جاں سے
نرالی ہے حسینانِ جہاں سے دلبری اُن کی

پھر سالک کو یہ بھی احساس رہتا ہے کہ اس کو معیتِ الٰہی کی جو نعمت نصیب ہوئی ہے، وہ ذکرِ خداوندی اور یادِ الٰہی پر دوام کی برکت سے ہے بی اور کیوں نہ ہو، خود اللہ ربّ العزّت نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے:

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (سورۃ البقرۃ: ۱۵۲) ترجمہ: "پس تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا۔"

چناں چہ حضرت منصورؒ مناجات کے دوران اس بات کا برملا اعتراف واقرار کرتے ہیں:

پہنچ جاتا ہے ان کے ذکر سے مذکور تک ذاکر
بڑی دولت ہے گر حاصل ہو یادِ دائمی اُن کی

میں ان کو یاد کرتا ہوں وہ مجھ کو یاد کرتے ہیں
ہے میرے ساتھ ہر لحظہ نگاہِ باطنی اُن کی

سچی محبت کے لوازم میں سے ایک یہ بھی ہے کہ محبوب کی ناراضی کا اندیشہ ہر وقت لگا رہتا ہے۔ اسی لیے اہلِ محبت اپنی محبوب کی رضامندی کے ہر وقت طلب گار رہتے ہیں۔ جب دنیاوی محبتوں کا یہ معاملہ ہے تو پھر محبتِ الٰہی میں بندگانِ خدا کا کیا حال ہوگا۔ محبوب کی ناراضی و بے رُخی تو دور، ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ ناراضی کے تصور سے بھی ان کی روح کانپ جاتی ہے۔ ان کے نزدیک اپنے محبوب (اللہ تعالیٰ) کی ناراضی اور بے رُخی، تباہی اور قیامت سے کم نہیں ہوتی۔ چناں چہ حضرت منصور غوریؒ رب کی بارگاہ میں دورانِ مناجات یوں عرض گذار ہیں:

معیت گر نہ ہو اُن کی تو جینا ہو مرا مشکل
قیامت ہے، قیامت ہے، قیامت بے رخی اُن کی

عنایت گر نہ ہو اُن کی تو میں برباد ہوجاؤں
تباہی ہے، تباہی ہے، تباہی برہمی اُن کی

پھر ڈر اور خوف کے اِس عالم میں ان کے دل سے صدا آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت پانے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ ان کے دربار کی غلامی اور گداگری اختیار کر لی جائے اور ان کے در کے منگتے اور دریوزہ گر بن جائیں۔ چناں چہ اپنا حالِ دل یوں عرض کرتے ہیں:

مری عزت اِسی میں ہے کہ بن جاؤں گدا اُن کا
ہے شاہی سے بھی بہتر، مجھ کو دریوزہ گری اُن کی

جھکانا اُن کے آگے سر کو اپنے عین عزّت ہے
خوشی سے ڈال لو گردن میں طوقِ بندگی اُن کی

مناجاتِ منصور میں اب نصیحت کا پہلو در آیا، یہ نصیحت اپنے آپ سے بھی ہے اور اوروں سے بھی۔ فرماتے ہیں کہ ان کی بندگی کا حاصل یہی ہے کہ عاجزی اور تواضع اختیار کی جائے اور ہر طرف سے یکسُو ہو کر اخلاص کے ساتھ ان کے طالب بن جائیں۔

بجز خود کو مٹائے کوئی اُن کو پا نہیں سکتا
بلا اخلاص کے ہے نا مکمل بندگی اُن کی

پھر یہ بھی فرماتے ہیں کہ اصل چیز رب تعالیٰ کی معرفت ہے، اگر یہ دولت حاصل ہو جائے تو کیا کہنے، لیکن کسی کو یہ نعمت نصیب نہیں تو پھر وہ دل بے نُور ہے۔

نہ ہو جس دل میں ان کی معرفت بے نور ہے وہ دل
بڑی دولت ہے گر ہو جائے دل کو آگہی ان کی

مناجات میں شاعر نے اپنے دلی جذبات بارگاہِ رب العزّت میں نکال کر رکھ دیے، ان کی تعریف بیان کی، اپنی کمتری و عاجزی، بے مائگی و بے حیثیتی کا اظہار کیا، دعائیں مانگیں، اندیشہ ہائے محبت کی بات کی، حدیثِ دیگراں کے پردے میں حالِ دل رکھا۔ پھر اچانک موصوف شاعر جذبات سے مغلوب ہو گئے، ان کی آنکھیں نم ہو گئیں، اور دل دھڑکنے لگا۔ شاید بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن زبان گنگ ہو گئی، جذبات الفاظ پر غالب آ گئے۔ ایسے ہی موقع کی شاعر نے ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا۔

جب نطق کو یارائے گفتار نہیں ملتا
کہے دیتی ہے اشکوں کی زبان اکثر کیا کیا

لیکن کہنا چاہیے کہ یہاں شاعر محبتِ الٰہی کے جذبات سے مغلوب ہے، ان کے بے شمار احسانات کے احساس سے گراں بار ہے، اور اس احساس میں دل ان کی محبت میں سرشار ہے۔ اس لیے عرض گذار ہے

یہ آنکھیں کس لیے نم ہوگئیں، کیوں دل دھڑکتا ہے
اچانک یاد اے منصور شاید آگئی اُن کی

☆☆☆

ترے نام ہی میں حَلاوَت ملے
جو ذوقِ محبّت کی لذّت ملے
جو تیری رضا کی بشارت ملے
تو دونوں جہانوں کی راحت ملے
ترے عشق کے غم کی دَولت ملے
تو سارے غموں سے فراغت ملے
بہرحال بندہ پہ ہے بندگی
کرم ہے جو ذوقِ عبادت ملے
محبّت تو اے دِل بڑی بات ہے
یہ کیا کم ہے اس کی جو حسرت ملے
یہی زندگی جاوِدانی بنے
جو آبِ حیاتِ محبّت ملے

ارمغانِ سلیمانی

☆☆☆

سُلُوک کی ڈاک

سلسلہ نمبر (۳)

ہدایۃ السالکین

سوال نمبر (۱):

دن و رات میں مراقبہ کتنی دیر کرنا چاہیے اور حضرت جی قدس اللہ سرہ کا کیا معمول تھا؟

جواب: کثرتِ مراقبہ کی کوئی حد مقرر نہیں۔ یہ ایسا مبارک عمل ہے کہ آپ جتنا زیادہ اس کے لیے وقت دیں گے اتنا آپ کو اللہ پاک کی یاد نصیب ہوگی۔ ایک جگہ حضرت جی قدس اللہ سرہ نے خود لکھا ہے کہ شروع شروع میں آپؒ کا معمول یہ تھا کہ تین تین گھنٹے بغیر حرکت کیے مراقبہ کرتے تھے اور جب چھٹی کا دن آتا تو چھ چھ گھنٹے اور نو نو گھنٹے مراقبہ کیا کرتے تھے۔

سوال نمبر (۲):

دن و رات میں کتنی دفعہ مراقبہ کرنا چاہیے؟

جواب: جتنی دفعہ چاہیں کریں؛ لیکن بہتر یہ ہے کہ جب بھی کریں لمبا مراقبہ کریں۔ اور اگر ایک دفعہ لمبا مراقبہ نہیں کر سکتے تو پھر تھوڑا تھوڑا کریں مگر کریں ضرور۔

سوال نمبر (۳):

مراقبہ کے دوران اگر کسی کی آواز سے خلل ہو جائے یا موبائل کی رنگ ٹون بجنے پر اگر موبائل کو بند کرنا پڑے تو کیا مراقبہ ٹوٹ جائے گا؟

جواب: اس سے مراقبہ نہیں ٹوٹتا، ہاں نیت کا دوبارہ استحضار کر لینا بہتر ہے۔ لیکن ایسی صورت میں مراقبہ سے نہیں اٹھنا چاہیے؛ ورنہ تسلسل برقرار نہیں رہے گا۔

البتہ اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ مراقبہ ایسے وقت میں ہو جب کہ مکمل یکسوئی ہو اور ایسی جگہ بیٹھ کر ہو

جہاں کسی بھی قسم کے خلل کا امکان نہ ہو۔ ایسے ہی مراقبہ کے وقت فون بند کر کے بیٹھیں۔ ان شاء اللہ اس سے خلل نہیں ہوگا۔

سوال نمبر (۴):

مستقل محنت کے باوجود مراقبہ میں زیادہ دیر تک بیٹھا نہیں جاتا۔ براہِ کرم رہنمائی فرمائیں؟

جواب: پہلی بات یہ ہے کہ مستقل محنت سے آپ کی مراد کیا ہے؟

اگر پانچ یا دس منٹ آنکھیں بند کر کے بیٹھتے ہیں یا ہفتہ میں ایک یا دو دفعہ بیٹھ جاتے ہیں تو جان لیں کہ اس کو مستقل محنت نہیں کہتے۔ ہاں کوئی سالک روز آنہ آدھا گھنٹہ بیٹھنے کی کوشش کرے پھر بھی مراقبہ میں زیادہ دیر تک بیٹھا نہیں جاتا تو پھر انفرادی طور پر شیخ سے مل کر اپنے احوال پیش کرے۔ کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوگا جس کی وجہ سے زیادہ دیر تک اللہ تعالیٰ کی یاد میں بیٹھنے کی توفیق نصیب نہیں ہو رہی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ کسی کا دل دکھایا ہوگا، یا کسی کی آہ لگی ہوگی، یا پھر کاروبار اور غذا میں حرام کی ملاوٹ ہوگی، کچھ نہ کچھ مسئلہ ضرور ہوگا جس کی وجہ سے دیر تک مراقبہ کی توفیق نصیب نہیں ہو رہی ہے۔ ایسی صورت میں شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر احوال پیش کر کے اپنی اصلاح کروانی چاہیے۔

سوال نمبر (۵):

نماز میں اکثر غیر اختیاری طور پر مراقبہ جیسی کیفیت شروع ہو جاتی ہے؛ جیسا کہ کبھی اچانک دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے تو کیا اس کیفیت میں آنکھیں بند کر سکتے ہیں؟

جواب: سالک جب کثرت سے مراقبہ کرتا ہے تو کبھی کبھار نماز میں بھی یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے؛ لیکن اس کی وجہ سے آنکھیں بند نہیں کرنا چاہیے۔ نماز میں آنکھیں بند کرنا تو خلافِ سنت ہے۔ ایسے ہی اپنے خیال کو اُدھر سے ہٹانے کی بھی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ دل اپنی جگہ اللہ اللہ میں مشغول رہے اور آپ ارکانِ نماز کی ادائیگی میں مصروف رہیں۔

سوال نمبر (۶):

مشائخ فرماتے ہیں کہ معمولات کی پابندی سے گناہوں سے بچنے کی توفیق ملتی ہے۔ اس کی وضاحت چاہتا ہوں۔

جواب: جی ہاں! جو بندہ بیعت کے بعد بتائے گئے معمولات پر عمل کرتا ہے تو ان معمولات میں اتنی طاقت اور ایسا اثر ہے کہ بندہ خود بہ خود گناہوں سے دور ہوتا جاتا ہے۔ بندہ چاہے بڑے سے بڑے گناہ میں

ملوث ہو، ان معمولات پر عمل کی برکت سے اللہ پاک اس کو گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرما دیتے ہیں۔ لہٰذا سالک کو چاہیے کہ پوری ہمت کے ساتھ نفس پر جبر کر کے گناہوں سے بچنے کی کوشش کرے اور معمولات کو بڑھاتا جائے۔

سوال نمبر (۷):

کیا ہر بندے کے لیے ہر وقت معمولات کی پابندی کرنا آسان ہے؟

جواب: جی ہاں! بالکل آسان ہے شرط یہ ہے کہ بندہ خود کرنا چاہے۔ اگر خود ہی نہ چاہے تو بہانے ہزار ہیں۔

سوال نمبر (۸):

سالکین کے لیے بتائے گئے معمولات اور ہدایات پر کیا دیگر حضرات (غیر سالکین) عمل کر سکتے ہیں؟

جواب: مشائخ کی طرف سے سالکین کے لیے جو معمولات متعین وقت اور متعین مقدار کے ساتھ بتائے جاتے ہیں، مثلاً: ہمارے سلسلہ میں مراقبہ اور وقوفِ قلبی وغیرہ ہیں ان پر غیر سالکین عمل نہیں کر سکتے۔

ہاں! مطلق دعائیں، اذکار اور وظائف جو سب ہی کے لیے بتائے جاتے ہیں، ان پر عمل کرنے میں حرج نہیں۔

سوال نمبر (۹):

کبھی کبھی سلسلے کے معمولات میں بتائی گئی متعین مقدار سے زائد مقدار میں تسبیحات پڑھنے اور تلاوتِ قرآن کرنے کو جی چاہتا ہے، ایسے ہی کبھی دیگر تسبیحات مثلاً حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ یا یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ کا ورد کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ایسے میں ہمارے لیے کیا رہنمائی ہے؟

جواب: ماشاء اللہ! بہت اچھی بات ہے، لیکن مراقبہ متعین مقدار سے کم نہیں ہونا چاہیے بلکہ کبھی کبھی یہ بھی شیطان کی ایک چال ہوتی ہے کہ بندے کو مراقبے سے ہٹا کر دیگر تسبیحات وغیرہ میں لگا دیتا ہے۔

حضرت جی قدس سرہ فرماتے تھے کہ: مراقبہ کی مثال اینٹی بائیوٹک (antibiotic) کی ہے، اس سے ہماری ننانوے فیصد روحانی بیماریوں کا علاج ہوتا ہے، اس کے علاوہ جو دیگر معمولات ہیں تسبیحات اور تلاوتِ قرآن وغیرہ، ان سے ثواب تو ملے گا لیکن روحانی بیماریوں کا علاج نہیں ہوگا۔

لہٰذا اگر ہمیں دیگر معمولات کے پورا کرنے کے بعد وقت مل رہا ہے تو تسبیحات میں اضافہ کے بجائے مراقبہ میں ہی مشغول ہونا چاہیے۔ حضرت جی قدس سرہ یہی ارشاد فرماتے تھے۔

☆☆☆

اصلاحی و تربیتی منظوم کلام

سلسلہ نمبر (۳)

تُو تو بس اپنا کام کر، یعنی صدا لگائے جا

(حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحب غوری رحمۃ اللہ علیہ)

تری بَلا سے کچھ بھی ہو تو اَدا دِکھائے جا
روتا ہے روئے کُل جہاں تو یونہی مسکرائے جا

جام پہ جام لائے جا، شانِ کرم دِکھائے جا
پیاس مِری بڑھائے جا روز نئی پلائے جا

شوق سے بزمِ غیر میں شَرم و حیا جتائے جا
یوں تو نظر چُرائے جا، دِل میں مگر سمائے جا

ہاں مجھے مثلِ کیمیا خاک میں تُو مِلائے جا
شان مِری گھٹائے جا رُتبہ مِرا بڑھائے جا

کھولیں وہ یا نہ کھولیں دَر، اس پر ہو کیوں تِری نظر
تُو تو بس اپنا کام کر یعنی صَدا لگائے جا

غم سے کہاں فراغ ہے، دِل پہ تو روز داغ ہے
قبضہ میں تیرے باغ ہے، نت نئے گُل کھلائے جا

دین کا دیکھ ہے خطر، اُٹھنے نہ پائے ہاں نظر
کُوئے بُتاں میں تُو اگر جائے تو سَر جھکائے جا

رونا نہ چھوڑ چشمِ نم بننا اگر ہو جام و جم
خونِ جگر بہائے جا حُسنِ نظر بڑھائے جا

دیکھ یہ راہِ عشق ہے ہوتی ہے بس یونہی یہ طے
سینہ پہ تیر کھائے جا آگے قدم بڑھائے جا

رکھ نہ خوشی کی تو ہوس، دِل کی ہے اس میں خیر بس
اشک اسے پلائے جا، آگے قدم بڑھائے جا

بیٹھے گا چین سے اگر کام کے کیا رہیں گے پَر
گو نہ نکل سکے مگر پنجرہ میں پھڑ پھڑائے جا

سب ہوں حجاب بَرطرف دیکھوں تجھی کو ہر طرف
پَردے یونہی اُٹھائے جا، جلوے یونہی دِکھائے جا

سوزشِ دِل تو ہو فزوں، شورشِ دِل کو ہو سکوں
جذب کو میرے اَے جنوں اور بھی تُو بڑھائے جا

جس طرف بھی تیری خاطر تیرے دیوانے گئے
آہِ سرد و نالۂ پیہم سے پہچانے گئے

ہنس نہ تو اے معترض اہلِ فنا کے حال پر
رہ کے دُنیا میں بھی وہ دُنیا سے بیگانے گئے

باغِ دِل تازہ ہوا اور اُس کے غنچے کِھل گئے
جب درِ جاناں پہ ہم اشکوں کو برسانے گئے

میری آہِ نیم شب کی بھی عجب پرواز ہے
ساکنانِ لامکاں تک میرے افسانے گئے

مِل گئی مُردہ دِلوں کو روشنیٔ آگہی !
ڈوب کر جب بحرِ غم میں تیرے دیوانے گئے

رہروانِ عشق کا عالم ہی ہوتا ہے جدا
جس طرف بھی یہ گئے ساتھ اُن کے ویرانے گئے

دیکھئے اندازِ عشقِ لاأُبالی دیکھئے
شمع پر ہونے فِدا بے خود پروانے گئے

خود پسندی اور خودبینی ہے بند گمرہاں
چھوٹ کر اِس قید سے بس تیرے دیوانے گئے

خاک میں مجھ کو مِلا کر جانِ نَو کی ہے عطا
اِس کرم کے میں فِدا خالی نہ پیمانے گئے

دیکھ کر فقدان تیرے قلب میں اخلاص کا
زاہدِ خودبیں تیری محفل سے دیوانے گئے

عقل کو عیّار پاکر ہو گئے منصورؔ الگ
ہم جہاں پر بھی گئے بس بن کے دیوانے گئے

حضرت سید منصور غوری صاحبؒ
دادا جان حضرت مدیر محترم